رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نکہت

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت تین روپیہ
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت چار روپیہ
علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جسمیں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں، حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

مختارات نیاز

حضرت نیاز فتحپوری کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ، اس میں اکثر و بیشتر وہ افسانے شامل ہیں جو دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں اور اپنی دلچسپی و افادیت کے لحاظ سے خاص درجہ رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دوسری زبانوں کے افسانے کیونکر اپنی زبان میں لینا چاہیئے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہوں، مجلد نہایت عمدہ طباعت کاغذ اور نفیس گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ

مکتوبات نیاز

دو حصوں میں

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل نئی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت ہر حصہ تین روپیہ
علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون بعد اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ
علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد دی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئینگے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب حصہ ۲، ۳

اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ
علاوہ محصول

جھانسی کی رانی

نیاز فتحپوری کے قلم سے

اس ڈرامہ سے نہ صرف ۱۸۵۷ء کے ان واقعات پر روشنی پڑتی ہے جو ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کا باعث ہوئے بلکہ راجاؤں کے ان اندرونی اختلافات کا بھی حال معلوم ہوتا ہے جو ملک کو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں دیدینے کا بڑا سبب تھے اس ڈرامہ کے وہ حصے خصوصیت کے ساتھ بہت دلچسپ ہیں جنمیں رانی کی زندگی کے آخری لمحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ

اصحاب کہف

یہ ڈرامہ ایک مصری انشاء پرداز "توفیق الحکیم" کی کتاب "اہل الکہف" کا ترجمہ ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے نہایت لطیف انداز سے "اصحاب کہف" کی روایت پر عاقلانہ تبصرہ کیا ہے، اس تمثیل کی جان وہ حصہ ہے جہاں موضوع محبت پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کی ابدیت کو بالکل چھوتا انداز سے پیش کیا گیا ہے ترجمہ حضرت نیاز نے کیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

نگار

مدیر خصوصی:- نیاز فتحپوری

جلد ۵۲	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۴۷ء	شمار ۶

ملاحظات ---------- ۳
بچوں کی نفسیات --- محمد عظیم ---------- ۵
انشاء اللہ خاں کی مثنویاں --- رحمت نبی خاں ام۔اے (علیگ) ۱۰
عرفی شیرازی --- (ڈاکٹر) نذیر احمد ام۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی --- ۲۳
عہد عباسی کا ایک تاریخی واقعہ ---------- ۴۵
جذبات عالیہ اور اردو شاعری --- ولی کمال خاں ام اے -- ۴۹
منظومات --- نازش، عرشی، کلیم، درد ---- ۵۵
دلچسپ معلومات ---------- ۵۷
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۹
اشتہارات ---------- ۶۳

اس سال کا یہ آخری پرچہ ہے

اور

آئندہ جنوری ۴۸ء کا "نگار"

جوبلی نمبر ہوگا

جس کی قیمت خریداران نگار سے بھی عہ زاید لی جائے گی یعنی یہ پرچہ ہر شخص کے نام ذریعہ وی، پی بھیجا جائے گا اور اگر آپ کی خریداری دسمبر ۴۷ء یا جنوری ۴۸ء میں ختم ہوتی ہے تو وی پی چھ روپیہ آٹھ آنے ہوگا ورنہ ڈیڑھ روپیہ کا ــــ اگر خریداری منظور نہیں ہے تو اب بھی وقت ہے کہ آپ ہمیں بواپسی ڈاک مطلع کر دیں، ورنہ بصورت خاموشی وی پی بھیجا جائے گا اور واپسی میں ہمیں پانچ آنہ کا نقصان ہوگا۔

اس پرچہ کی روانگی نمبر خریداری کے لحاظ سے سلسلہ وار ہوگی اس لئے ۱۵ جنوری ۴۸ء تک اسکا انتظار کیجئے۔

جوبلی نمبر کس قدر اہم چیز ہے اس کا اندازہ آپ کو صفحہ ۲ کے اشتہار سے ہو سکے گا، نیز اس امر سے کہ غیر خریداران نگار سے اس کی قیمت علاوہ محصول تین روپئے مقرر ہے۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

جوبلی نمبر ہر شخص کے نام ذریعہ رجسٹری بھیجا جائیگا اور وی پی میں رجسٹری کے مصارف شامل ہونگے اسلئے اگر آپ چندہ پیشگی بھیجیں تو چھ روپیہ آٹھ آنہ روانہ فرمائیں۔

"نگار" کا جوبلی نمبر

پاکستان نمبر ہوگا

اگر آپ نے کوئی جواب نہ دیا تو آپ کے سکوت کو رضامندی سمجھکر وی پی بھیجا جائے گا

۱۔ لیکن اس میں نہ حصول پاکستان کی تاریخ ہوگی، نہ مسلم لیگ کے جدوجہد کی داستان، کیونکہ اس سے ہر شخص واقف ہے بلکہ پاکستان اور ہندوستان کی تمام مسلم آبادی کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا جائیگا تاکہ مسلمانوں کی یہ جدید آزاد حکومت اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں اور اُن کارناموں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ گویا بہ لحاظ موضوع یہ

تمدن اسلامی نمبر بھی ہوگا

۲۔ اس نمبر کی ضخامت ۲۵۰ صفحات سے زیادہ ہوگی اور اسکی تیاری میں ہم کو تین ہزار روپیہ زاید صرف کرنا پڑیں گے اس لئے خریداران نگار سے امید ہے کہ وہ اس مخصوص نمبر کے لئے جو کتابی صورت میں ۶۰۰ صفحات کو محیط ہوتا۔ ڈیڑھ روپیہ دینا گوارا فرمائیں گے ہم ان حضرات کے نام جن کا چندہ دسمبر ۴۷ء یا جنوری ۴۸ء میں ختم ہوتا ہے، جنوری ۴۸ء کا نگار ذریعہ وی پی چھ روپیہ آٹھ آنہ میں (معہ مصارف رجسٹری) روانہ کرینگے اور جنکا چندہ ختم نہیں ہوتا انکے نام کا وی پی ڈیڑھ روپیہ میں (معہ مصارف رجسٹری) بھیجا جائے گا۔

تمام مقالات اڈیٹر نگار کے قلم کے ہونگے

حضرت نیاز فتحپور کی ایک بے مثل تصنیف

"من و یزداں"

جو اپنی انشاء عالیہ اور پرزور خطیبانہ تحریر کے لحاظ سے معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتی ہے
اور اخلاقی تعلیمات، کے لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ اسے صحیح معنے میں

انجیل انسانیت ——— کہہ سکتے ہیں

اس میں مذاہب کی تخلیق، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم، دینی عقاید اور کتب الہامی کی حقیقت پر، بسیط تاریخی، علمی، نفسیاتی اور اخلاقی بحث کی گئی ہے

یہ کتاب ادبی حیثیت سے بھی اڈیٹر نگار کا وہ کارنامہ ہے جسے ادب و انشاء میں "حرف آخر" کہا جاسکتا ہے۔
حجم ۶۰۲ صفحات۔ کاغذ سفید و دبیز، جلد مضبوط۔ قیمت علاوہ محصول سات روپیہ آٹھ آنے۔ مینجر نگار۔ لکھنؤ

ملاحظات

ہندوستان کا ہولناک مستقبل

یونتو قتل و خونریزی کی ابتدا بہت پہلے ہی ہو چکی تھی اور کلکتہ، نواکھالی، بہار اور مغربی یوپی کے بعد لاہور اور مضافات لاہور تک یہ آگ پھیل گئی تھی، لیکن ۱۵ اگست کے بعد جب تقسیم ہند عمل میں آچکی، تو اس نے زیادہ بھیانک شکل اختیار کرلی، یہاں تک کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کا صدر مقام (دہلی) بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ خیر، دہلی کی قسمت میں تو قتل و خونریزی لکھی ہی ہے۔ اس سے قبل بھی بارہا اس کی گلیوں میں انسانی خون پانی کی طرح بہ چکا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ اور کتنی بار اس کو اس نوع کی انسانی درندگی کا شکار ہونا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کا اثر ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ خراب پڑا۔ پاکستان میں تو یہ کہ وہاں کے لوگوں کو ہندوؤں کی ذہنیت کو مسلم کش ذہنیت ثابت کرنے کا زیادہ موقعہ ملگیا اور ہندوستان میں یہ کہ مسلمانوں کے دل خوف و اندیشے سے بھر گئے اور ان کو یہ خیال پیدا ہو چلا کہ حکومت واقعی اقلیت کی حفاظت نہیں کرنا چاہتی یا کر نہیں سکتی، پھر اگر یہ بات صرف اتنی ہی ہوتی اور یہ جھگڑا محض ہندو مسلم اختلاف کا ہوتا تو بھی غنیمت تھا لیکن اب بات شاید راز نہیں رہی کہ دہلی کی بدامنی ایک ایسی منظم سازش کا نتیجہ تھی جس کا مقصود ہندوستان کی موجودہ حکومت ہی کو معزول کر دینا اور اس کی جگہ خالص ہندو حکومت کو قایم کرنا تھا۔ یہ بات اب کسی سے مخفی نہیں کہ دہلی میں جو کچھ ہوا وہ راشٹر سیوک سنگھ، ہندو مہا سبھا اور سکھوں کے اکالی دل کی منظم سازش تھی جس میں بعض راجپوت ہندو ریاستیں بھی شریک تھیں اور جس کا مقصود موجودہ حکومت اور خصوصیت کے ساتھ پنڈت نہرو کو معزول کر دینا تھا۔ اس کے ثبوت میں ہندو سبھا کے اخبار ہندو اوٹ لک کا وہ بیان پیش کیا جا سکتا ہے، جس نے اس سازش کی طرف اشارہ کیا تھا اور سیوک سنگھ کے اخبار ارگنائزر کا وہ تہدیدی نوٹ جس میں صاف صاف تحریر تھا کہ "پنڈت نہرو اور دوسرے وزراء کا وہی حشر ہوگا جو برما کے وزیروں کا ہوا ہے"۔ اسی کے ساتھ جب ہم جنم بھومی کے خصوصی نامہ نگار کا بیان پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سازش کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور راجپوتانہ کے رجواڑے حکومت ہند کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا کر پٹیالہ سے کاٹھیاوار تک راجستھانی حکومت قایم کرنے کی فکر میں تھے۔ الغرض یہ تھی وہ سازش دہلی کے ہنگامہ و فساد کی تہ میں، جس کا علم پنڈت نہرو کو ہو چکا تھا اور انھوں نے اسی لئے بہ لحاظ حفظ ماتقدم مدراس رجمنٹ اور گورکھا فوج کا انتظام کر لیا تھا۔ پھر پنڈت نہرو نے جس دلیری و ہمت سے کام لیا اس کا حال سب کو معلوم ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر وہ اس وقت دہلی میں نہ ہوتے، تو شاید مسلمانوں کا کوئی فرد وہاں باقی نہ رہتا اور حکومت اسوقت مہا سبھائیوں کے ہاتھ میں ہوتی یا یہاں سکھستان و راجستھان قایم ہو گیا ہوتا۔

ہر چند اب دہلی میں نسبتاً امن و سکون ہے اور سردار پٹیل بھی بدرجۂ مجبوری راجستھان و سکھستان وغیرہ کا خواب دیکھنے والوں کو متنبہ کر چکے ہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ آیندہ کے خطرات کم ہو گئے ہیں، یا مہاسبھائی ذہنیت ختم ہو گئی ہے، وہ برابر بڑھ رہی ہے اور غالباً اسی ارادہ کے ساتھ جس کا اظہار جنرل کری اپا نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ "ہندوستانی فوج دو سال کے اندر پاکستان کو ہندوستان میں شامل کرلے گی"۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ جارحانہ ذہنیت اسی طرح بڑھتی رہی اور ہندوستان کے اکابر کی طرف سے ایسے ہی غیر دانشمندانہ بیانات شایع ہوتے رہے، تو آتش جنگ مشتعل ہو جانا بعید نہیں ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ مہاسبھائیوں کو اپنے مقصد میں آسانی سے کامیابی حاصل نہ ہو جائے گی۔

مانا کہ پاکستان، ہندوستان کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے ضعیف ہے، لیکن اگر ان دونوں حکومتوں میں جنگ چھڑ گئی تو یہ صرف پاکستان و ہندوستان کی جنگ نہ ہوگی بلکہ ساری دنیا کی جنگ ہوگی کیونکہ پھر امریکہ اور روس بھی (جن کے درمیان کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے) خاموش بیٹھے نہ رہیں گے اور یہ دونوں پاکستان پر اپنا اثر قایم کرنے کے لئے بڑی سی بڑی قیمت ادا کرنے پر طیار ہو جائیں گے ۔۔ پاکستان میں اب بھی امریکہ اور اسی کے ساتھ برطانیہ آہستہ آہستہ اپنے اثرات بڑھا رہا ہے جس کو روس اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا کیونکہ کراچی کی بندرگاہ پر عرصہ سے اسکی نگاہ ہے، اس لئے اگر ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو یہ اس قسم کی جنگ نہ ہوگی جیسی اسوقت قبایلی قزاقوں اور ہندوستانی فوجوں کے درمیان کشمیر میں ہو رہی ہے بلکہ یہ بین الاقوامی جنگ ہوگی، ایک عالمگیر جنگ ہوگی، جس میں افغانستان، ایران، مشرق ادنیٰ اور روس و امریکہ سبھی شامل ہوں گے اور اس کا کھلا ہوا نتیجہ ہندوستان کی بربادی ہے ۔۔ اس لئے ملک کی موجودہ نازک حالت مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ ہندوؤں کے لئے بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے اور اس خطرہ کو دور کرنے کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ہندوستان سے مہاسبھائی ذہنیت اور پاکستان سے مذہبی تنگ نظری دور ہو اور دونوں حکومتیں آیندہ کے پروگرام پر اس نظریہ کو سامنے رکھکر غور کریں کہ ان دونوں حکومتوں کو آپس میں ملکر ترقی کرنا ہے ۔ لیکن اس میں اسی وقت کامیابی ممکن ہے جب ہندوستان کی موجودہ وزارت کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں

مسلم لیگ تو اب باقی نہیں اور نہ اسکے باقی رہنے کی کوئی وجہ، اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو سوچنا ہے کہ انھیں کونسی راہ اختیار کرنا چاہئے ۔ اخیر دسمبر میں بصدارت مولانا آزاد لکھنؤ میں مسلمانوں کا بڑا اجتماع ہو رہا ہے جس میں مسلمانوں کی آیندہ سیاسی پوزیشن پر غور کیا جائے گا اور توقع یہی کی جاتی ہے کہ فیصلہ، شرکت کانگرس ہی کے حق میں ہوگا، لیکن ہماری رائے میں یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ کوئی اپنا بلاک الگ بنا کر شریک ہوں، وہ جمعیۃ العلما، ہو یا نیشنلسٹ جماعت، حزب الاحرار ہو، یا جمعیۃ الانصار، ان سب کو ختم ہو جانا چاہئے اور مسلمانوں کو کانگرس میں مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ باشندۂ ہندوستان کی حیثیت سے شریک ہونا چاہئے، کیونکہ اب سوال جداگانہ انتخاب کا بھی نہیں ہے اور کانگرس کو مہاسبھائیوں کے مقابلہ میں صرف اسی طرح تقویت پہونچ سکتی ہے اور آیندہ انتخاب میں مہاسبھائیوں کو ناکام بنانے کی یہی ایک صورت ہے ۔

بچّوں کی نفسیات

بچّوں کی نفسیات کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے اور ان لوگوں کو جو بچّوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، کچھ خاص قسم کی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بالغ آدمی تو بتا سکتا ہے کہ فلاں حالت میں اس کے دماغ کی یہ حالت ہوتی ہے، یعنی نفسی اصطلاح میں وہ آپ کو اپنے مشاہدۂ نفس سے واقف کرسکتا ہے اور آپ اسکی دماغی خصوصیات کا نسبتاً آسانی سے تجزیہ کرسکتے ہیں لیکن اسکے برعکس بچّہ جانور کی طرح گونگا ہوتا ہے اور اس لئے اس کے نفسی مطالعہ کے لئے مشاہدہ شرط اولین ہے۔

بچّوں کی نفسی و دماغی حالت کا مشاہدہ کرنے کے لئے خاص سلیقہ کی ضرورت ہے۔ بچّوں کے متعلق ڈائری رکھنے والوں میں ڈارون کا شمار اولین لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد اکثر لوگوں نے جن میں پریئر (Preyer) کا نام بہت مشہور ہے، بچّہ کے پیدائش کے بعد ہی سے اس کی روزانہ حرکات تحریر کی ہیں اور ہر ماں تھوڑی سی تربیت کے بعد بچّہ کے متعلق اس قسم کا اندراج رکھ سکتی ہے۔ یہ اس کے لئے نہ صرف ایک دلچسپ مشغلہ ہوگا بلکہ اس سے بچّہ کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے لئے کافی مواد بھی ہاتھ آجائیگا کہ بچّہ نے کس عمر میں کن حالات کے تحت خارجی اشیا سے دلچسپی لینا شروع کی، اس کی زندگی کے کس دور میں جذبات ظاہر ہوئے اور کس طرح آہستہ آہستہ عقل کا عروج ہوا۔

انسان بھی دوسرے جانوروں کی طرح ماحول اور وراثت کی پیداوار ہے۔ ہر فرد کچھ خاص طبعی رجحانات لیکر پیدا ہوتا ہے، یعنی اچھائی یا برائی کی کچھ خاص صلاحیتیں اس میں ودیعت ہوتی ہیں۔ یہ موروثی میلانات، جب تک مناسب ماحول انکی تکمیل کے لئے نہ ملے، پوشیدہ رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر بیج کو لیجئے کہ اگر زرخیز اور مناسب جگہ میں تخم ریزی کی جائے اور اس کی پوری طرح نگرانی کی جائے تو اس سے پیدا ہونے والا پودا اپنے طبعی قد کو پہونچے گا ورنہ نہیں۔

موافق حالات میں پرورش پانے سے بچّے معیاری آدمی بن جاتے ہیں۔ حالات ناموافق ہونے سے بچّہ صرف ناکارہ ہی نہیں بلکہ ہیئت اجتماعیہ کے لئے ایک خطرناک فرد ثابت ہوسکتا ہے۔ ہر بچّہ میں بگڑنے اور بننے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں اسی لئے مناسب تربیت بہت ضروری چیز ہے۔

بچّوں کے دماغ کو سمجھنے کی کوشش اپنی ابتدائی شکل میں قیاس ہی کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے۔ نوزائیدہ بچّہ کو اپنے وجود کا بالکل خیال نہیں ہوتا اور اسکا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ وہ خود کو اپنے ماحول سے ممیز کرسکتا ہے وہ کچھ احساسات تو ضرور رکھتا ہے لیکن یہ احساسات اور اعمال اس کی ذات سے وابستہ نہیں ہوتے، البتہ ماحول سے خود کو ممیز کرنے والے احساس کی ترقی کے تمام امکانات اس میں

موجود ہوتے ہیں۔ بچہ جیسے جیسے بڑھتا جاتا ہے اس کو خود اپنے احساسات سے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اور مسرت کو مسرت کی خاطر حاصل کرنے کا رجحان پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اسے زندگی کی "خود آسودانہ" (Autoerotic) منزل سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ترقی کی دوسری منزل اس وقت شروع ہوتی ہے جب بچہ اپنے جسم سے دلچسپی لینے لگتا ہے اور اس میں ابتدائی احساس خودی کا پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً یہ کہ یہ خوشگوار ہے، یہ ناخوشگوار ہے، مجھے اس کا ذائقہ لذیذ معلوم ہوتا ہے'۔ مجھے اپنی ٹانگ میں درد محسوس ہوتا ہے' اس منزل کو منزل خود پرستی Narcissism یا منزل نرگسی کہا جاتا ہے اس کا یہ نام اس یونانی روایت سے لیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ نرگس خود اپنی صورت پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ خارجی دنیا سے دلچسپی کا نمبر بچوں میں سب سے بعد آتا ہے۔ اسے ہم خارجی محبت کی منزل کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اس منزل میں قدم رکھتے ہی انسانی زندگی غیر معمولی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ ابتدائی ایام طفولیت میں بچہ کی رہنمائی اس کا جذبۂ مسرت کرتا ہے اسے اپنے برے بھلے کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ لیکن خارجی محبت کی منزل میں ابتداء ہی سے اس میں خارجی دنیا کو سمجھنے بوجھنے کا مادہ بڑھ جاتا ہے۔ شروع شروع میں بچہ جاندار اور بے جان اشیاء میں تمیز نہیں کر سکتا، وہ ہر شے کو اپنی ذات کے نمونہ پر ڈھالتا ہے اور وہ جاندار یا بے جان چیز کو اپنی طرح کی شخصیت عطا کرتا ہے۔ بچہ اس عمر میں مخالف جنسوں میں تمیز نہیں کر سکتا۔

تجزیۂ نفس کی بہت اہم دریافت جس پر بعض لوگ اعتبار نہیں کرتے یہ ہے کہ بچہ میں جنسی میلان بھی ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جنسی خواہشات سن بلوغ میں پیدا ہوتی ہیں اور چھوٹے بچے جنسی وقوف سے بالکل معرا سمجھے جاتے ہیں، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ جنسی میلان ایسی چیز نہیں جو بچہ میں دفعتاً پیدا ہو جاتا ہو وہ پیدائشی چیز ہے جو آہستہ آہستہ مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بچوں کے جنسیاتی مظاہر، بالغوں کے جنسیاتی طریق مظاہر سے مختلف ہوتے ہیں۔ بہت سے ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ بچوں میں انگوٹھا چوسنے کی عادت جو اس قدر عام ہے، وہ اسی بنا پر جنسی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ بچے کے جسم کے مختلف اعضاء مثلاً ہونٹ، چوتڑ، بول و براز کے سوراخ اور آلات تناسل میں ایک خاص ذکاوت حس پائی جاتی ہے۔ جسم کے ان اعضاء میں سے جب کسی خاص عضو سے بچہ کو سرور حاصل ہونے لگتا ہے تو یہ سرور اپنی بڑھی ہوئی شکل میں اس خاص احساس سے مشابہ ہو سکتا ہے جو جوان آدمیوں میں جنسی جذبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ جنسی مظاہر کا بچوں میں بالکل فقدان ہوتا ہے۔ تجزیۂ نفس ہمیں بتاتا ہے کہ ابتدائی طفلانہ زندگی میں بھی بچہ کی محبت کے تعلقات میں جنسی احساسات شامل ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ والدین بھائی اور بہنوں کی محبت میں بھی جنسی عنصر کارفرما ہوتا ہے بچہ کے بڑے ہوتے پر جب تہذیبی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں تو جنسی عنصر کو لاشعور میں دبا دیا جاتا ہے اور پدرانہ یا برادرانہ محبت جنسی رنگ و روغن سے معرا ہو کر شعور میں داخل ہوتی ہے۔ بچہ کی جنسی زندگی کا دور، خود آسودانہ، خود پرستانہ اور خارجی محبت کی ارتقائی منازل ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ خود آسودانہ دور میں بچہ کی محبت اپنے جسمانی احساسات تک محدود رہتی ہے۔ نرگسی دور میں وہ اپنے جسم کو نظر محبت سے دیکھتا ہے۔ اپنے ہم جنس سے محبت کرنا یعنی ایک مرد کا

دوسرے مرد سے یا ایک عورت کا دوسری عورت سے محبت کرنا، خود آسودانہ ارتقا کی پہلی منزل ہے۔ جنسیات کی دوسری منزل کے آغاز پر جنس مخالف سے محبت ہونے لگتی ہے۔ ایک مرد عورت سے ہی کیوں محبت کرے، یا ایک عورت مرد سے ہی کیوں اُلفت کی پینگیں بڑھائے، اس قسم کا سوال کرنا صحیح نہیں کیونکہ یہ عین فطرتِ انسانی ہے۔

تجزیۂ نفس اس کے علاوہ ہم کو یہ بھی بتاتا ہے کہ اکثر اعصابی امراض کی ابتدا بچپن کی جنسیاتی ترقی رک جانے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ منزل خود آسودگی میں محبت کے ٹھٹھر کر رہ جانے سے زندگی کا زاویۂ نگاہ مریضانہ ہو جاتا ہے اور تمام مسرتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ نرگسی منزل کے امراض کسی خاص قسم کا خوف خصوصاً موت کا خوف پیدا کر دیتے ہیں۔ اپنے ہم جنس کی محبت میں مداخلت ہو جانے سے اکثر ہسٹریا یا اسی نوع کے دیگر امراض پیدا ہو سکتے ہیں اور جنس مخالف کی محبت میں خلل پڑ جانے سے بھی زندگی کی روانی میں فرق پڑ سکتا ہے۔ بچہ کی ابتدائی جنسی محبت کا مرکز اس کے والدین ہوتے ہیں اور ترقی کی اس منزل پر رک جانے سے فرد اپنے خاندان کے دایرہ سے نکل کر کسی اور سے محبت کرنے کی اہلیت کھو بیٹھتا ہے۔ اپنے آپ کو حقیر سمجھنا، ضرورت سے زیادہ شرمانا اور خطا کا ایک مبہم احساس اس منزل کی خصوصیات ہیں۔ اس طرح آیندہ دماغی زندگی کی ترقی کا دارو مدار بچپن کی جنسیاتی زندگی پر ہے۔ فرائیڈ کا خیال ہے کہ بچہ میں ہر قسم کی جنسیاتی گمراہی کے امکانات ہوتے ہیں، لیکن اس کا انحصار بڑی حد تک ماحول پر ہے۔ بچپن کی خرابی بالغ زندگی پر بڑے دور رس نتائج مترتب کرتی ہے اس لئے ہمیں اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ انسان کی زندگی کے بناؤ بگاڑ میں جنسیات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ ——— اپنے وسیع معنوں میں یہ جنسیات ہی کا محور ہے جس کے گرد ہماری تمام سرگرمیاں چکر لگاتی ہیں۔ ہر فرد کا دماغی سکون و اطمینان اس کے گھر اور اس معاہدہ پر منحصر ہے۔ ——— جس کے بموجب اس کی گھریلو اور ازدواجی زندگی کے عناصر مرتب ہوتے ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جنسی زندگی ہی ازدواجی معاہدہ کو مضبوط بناتی ہے۔ جنسیاتی زنجیر سے صرف والدین ہی بندھے نہیں ہوتے بلکہ بچہ کو بھی لاشعوری جنسی معاہدہ سے سہارا اور مدد ملتی ہے اور یہی جنسی معاہدہ اسے خاندان کے دوسرے افراد سے منسلک کر دیتا ہے۔ بالغ آدمیوں میں جنسیاتی زنجیریں لاشعوری بن جاتی ہیں اسی لئے وہ ہماری نظر سے پوشیدہ رہتی ہیں۔

نظری اور میکانکی تفصیلات میں اُلجھے بغیر اب میں آپ کو مختصراً یہ بتاؤں گا کہ بچہ کی پرورش میں کیا کیا احتیاط برتنی چاہئے۔ بچوں میں باقاعدگی کی عادت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ بچہ کا منہ اور بول و براز کے سوراخ خاص طور پر ذکی الحس ہوتے ہیں، چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچہ کو چوسنے میں ایک مسرت آمیز احساس ہوتا ہے اور اگر اسے مقررہ وقفوں کے بعد دودھ نہ پلایا جائے تو وہ انگوٹھا چوس کر خود کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ انگوٹھا چوسنا بذات خود اس کی عادت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ عادت صرف جسمانی ہی طور پر مضر نہیں بلکہ دماغ پر بھی اس کا خراب اثر پڑتا ہے۔ بچہ کی صفائی کے ساتھ یہ خیال بھی رکھا جائے کہ اس کے جسم کے حساس اجزا پر بار بار ہاتھ نہ پھرے۔ ابتدائی عمر ہی سے بچہ میں اکیلے رہنے اور تھوڑی بہت دیر اندھیرے میں رہنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ اسے خوب بھینچ بھینچ کر جوش و اشتیاق کے ساتھ پیار نہ کرنا چاہئے۔ ماں اور باپ دونوں

جہاں تک ہو سکے، اسے برابر برابر پیار کریں اور اسی طرح اسے دونوں سے محبت کرنے کا موقع دیا جائے۔ والدین میں سے کسی ایک طرف سے نامناسب محبت کا اظہار بچہ کی دماغی صحت کے لئے مفید نہیں ہوتا۔ یک طرفہ اثرات سخت مضر ثابت ہوتے ہیں۔ بچہ کو نہ تو یہ سمجھنے کا موقع دیا جائے کہ اس کا ہر مطالبہ پورا ہو سکتا ہے اور نہ اس کے ہر مطالبہ کو نظر انداز کیا جائے۔ اکثر اکلوتے، سب سے بڑے یا سب سے چھوٹے یا ایسے بچوں کو جو اکثر بیمار رہتے ہیں، من مانے کام کرنے دئے جاتے ہیں، ایسے ہی بچے بڑے ہو کر دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ بچہ کو اپنے بہن بھائی اور دیگر بچوں سے ملنے جلنے دیا جائے۔ باہر والوں سے مانوس ہونے میں حتی الامکان اس کی ہمت افزائی کرنا چاہئے۔ بچہ کے شوق تحقیق کو روکنا نہیں چاہئے اور نہ اس کے تکلیف دہ سوالات نظر انداز کرنا چاہئے۔ تجزیۂ نفس ہمیں بتاتا ہے کہ بچوں کو پیدائش وغیرہ کے متعلق غلط معلومات بہم پہونچانے سے کتنا خطرناک نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ بچے اور والدین کو ایک دوسرے پر مکمل اعتماد ہونا چاہئے تاکہ جب بچہ کوئی بات جاننا چاہے تو وہ خود بخود اپنے ماں باپ سے اسے معلوم کر سکے۔ جب اس کی عمر ایک سال سے زیادہ ہو جائے تو اسے والدین کے ساتھ ایک ہی بستر پر نہیں سلانا چاہئے، دو تین سال کی عمر ہو جانے پر بچہ کو بالکل علیحدہ کمرہ میں سلانا بہتر ہوگا۔ بچہ کی خواہشات اور ضروریات کا بغور مطالعہ کیا جائے اور انکے کھیل اور تفریحات کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ وہ ان سے پوری طرح مطمئن ہو سکیں۔ بچہ کے میلانات کا مشاہدہ کرنے پر پتہ چلے گا کہ اس کے اکثر میلانات ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اپنے والدین سے محبت کرنا چاہتا ہے اور انکی محبت کا بھی طالب ہوتا ہے۔ کبھی یہ اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کی رہنمائی کرنا چاہتا ہے اور کبھی خود ان کی رہنمائی پسند کرتا ہے۔ اس نوع کے متضاد میلانات کی تسکین کے لئے اس کی حتی الوسع امداد کرنی چاہئے۔ میری رائے میں کسی انسان کی نفسی صحت بڑی حد تک ان ہی تناقضات سے محظوظ ہونے کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ بچہ کی صحیح تعلیم کے لئے محبت آمیز فضا بہت ضروری ہے بچہ جس سے محبت کرتا ہے اس کی نقل اتارتا ہے اور اس کے محبوب کا نصب العین اس کی دلچسپی کا مرکز بن جاتا ہے۔ ایک معلم جو اپنے متعلم میں محبت کی روح پھونک سکتا ہے اس معلم کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔

جس میں اس وصف کی کمی ہو۔ بچوں کی تعلیم کے لئے وقتاً فوقتاً متعدد طریقے ایجاد کئے گئے۔ یہ طریقے اسوقت تک مقبول رہے جب تک کہ ان کا موجد خود ان پر عمل کرتا رہا لیکن جونہی ان پر کسی باہر والے نے عمل کیا ان کی افادیت ختم ہو گئی۔ موجد کی شخصیت اور انہماک نے اس کے طریقۂ تعلیم کو کامیاب بنایا تھا۔ وہ معلم جس کی متعلمین عزت اور محبت نہیں کرتے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اب میں اس سلسلہ میں کچھ ہدایت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ تجزیۂ نفس کے ذریعہ دماغ کی تمام خرابیوں کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ دماغ کے ان امراض میں جو عضوی خرابیوں سے پیدا ہوتے ہیں، خالص دماغی علاج سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا، مثلاً جب غدۂ درقیہ کے عمل میں خرابی آجاتی ہے تو دماغی اور جسمانی ترقی رک جاتی ہے۔ درقیہ (جانوروں کے غدود سے طیار ہونے والی دوا) ایسے مرضوں پر اکسیر کا کام کرتی ہے۔ اسی طرح جب کسی بچہ کے دماغ میں پیدائشی خرابی ہوتی ہے تو بھی

علاج کا کوئی فایدہ نہیں ہوتا۔ بچّہ کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ بچّہ کی ذہانت میں ایک مقررہ حد کے بعد کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور تعلیمی ذرائع بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اب اس کی اہمیت تسلیم کرلی گئی ہے کہ بچّہ کا کبھی کبھی جسمانی معائنہ کراتے رہنا چاہئے اور بہت سے ممالک کے اسکولوں میں طبّی معائنہ کیا جاتا ہے، لیکن دماغی معائنہ کی ضرورت ابھی تک تسلیم نہیں کی گئی۔ بچّہ کی ترقی کے لئے دماغی صحت جسمانی صحت سے کم ضروری نہیں۔ بدقسمتی سے بہت سے اطبا نفسیاتی اجزا کے متعلق بہت واضح تصور نہیں رکھتے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ توانا جسم میں توانا دماغ ہوتا ہے، یہ صحیح نہیں۔ جسمانی طور پر توانا آدمی دماغی طور پر مریض ہوسکتا ہے اکثر حالتوں میں دماغ کے جداگانہ علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ عصر حاضر میں بچّوں کے دماغی علاج کی سہولتیں بہم نہیں پہونچائی جاتیں۔ جسمانی معائنہ کی طرح بچّہ کے نفسیاتی معائنہ کی بھی ازحد ضرورت ہے اور خصوصاً اس وقت جب بچّہ میں کوئی دماغی الجھاپن ظاہر ہو تو اس کا نفسی معائنہ فوراً نہ کرانا چاہئے۔ دماغی تکلیف اکثر جسمانی تکلیف کے مقابلہ میں زیادہ شدید اور خطرناک ہوتی ہے اور ہمیں دماغی مریضوں کی امداد میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھنا چاہئے۔ (ترجمہ) محمد عظیم

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

منجملہ ۱۲۴ عنوانات کے چند خاص عنوان ملاحظہ ہوں:-

فحاشی کی تعریف اور اسکی ابتدا ـــــ شادی، طلاق و خلع۔
مذہبی فحاشیاں ـــــ فحاشی پر عمومی تبصرہ۔
فحاشی قرون وسطیٰ میں ـــــ عہد جدید اور فحاشی۔
اخلاق جنسی ـــ غیر فطری فحاشیاں مثلاً:- استلذاذ بالمثل۔
استلذاذ بالنفس ـــــ استلذاذ بالوحوش۔

جنسی میلانات اور شہوانی خواہشوں پر اتنا جامع تاریخی، علمی و نفسیاتی تجزیہ آپ کو کہیں اور نظر نہ آئے گا، حضرت نیاز کی سالہا سال کی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے اور اُردو میں سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر یہی ہے

حجم ۱۶۴ صفحات ـــــ کاغذ سفید و دبیز ـــــ قیمت علاوہ محصول چار روپے

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

انشاء اللہ خاں کی مثنویاں

اُردو میں انشاؔ کی کوئی طویل مثنوی نہیں ملتی، چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں جن میں سے اکثر مضامین ہجو پر مشتمل ہیں۔ کھٹملوں مکھیوں، مچھروں اور بھڑوں کی ہجو میں جو مثنویاں لکھی ہیں وہ قریب قریب مولانا حالی کے پیش کردہ مثنوی پر پوری اُترتی ہیں۔ کیونکہ ان میں ربط بھی ہے، مقتضائے حال کی پابندی بھی ہے اور مافوق الفطرت عنصر بھی مفقود ہے البتہ "گیان چند ساہوکار کی ہجو" اور "چنچل پیاری ہتھنی" کی کہانی کے مضامین بہت رکیک ہیں ان دونوں مثنویوں میں سے پہلی مثنوی سوداؔ کی بیشتر مثنویوں کی یاد دلاتی ہے۔

"کھٹملوں کی ہجو" میں چھیانوے اشعار ہیں، ان میں انشاؔ نے تشبیہ و استعارے کا کمال دکھایا ہے، چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

کچھ یہ کھٹمل پڑے ہیں اب کی سال، کہ ہوئی سب زمین لالوں لال
چھا گئے ہیں جو سارے یہ بدبخت، شاخ مرجاں بنے تمام درخت
گھسی ایک ان کی جابجا لڑ ہے میخ جو ہے سو مونگے کی جڑ ہے
ہو گئے سُرخ بید سارے سرد لال مرغے بنے تمام تدرو
بسکہ جاکر جمے قطار قطار ہوگئی لالہ نرگسِ بیمار،
دشت اور کوہ پر کیا جو دخل نخل یاقوت بن گئے سب نخل
ان لعینوں کا یہ سہاگ ہوا تھا جہاں سبزہ لال ساگ ہوا

کھٹملوں کی ہجو میں انشاؔ کی طرح مصحفی نے بھی زبان کھولی ہے فرماتے ہیں:-

کھٹملوں کی زبسکہ ہے افراط تنگ ہے ان سے اپنا خواب نشاط
کافروں نے یہ سر اُٹھایا ہے سارے پنڈے کو توڑ کھایا ہے
کیا کہوں ان گزندوں کی زشتی کہ مجھے کر دیا ہے خارشتی،
ہے چمکی آگ سی بدن میں تمام پڑ گئے ہیں دو دو ڑے تن میں تمام
دم بدم کروٹیں بدلتا ہوں، اِدھر اُودھر پڑا اُچھلتا ہوں

پائینچے میں کبھی گھس آتے ہیں کبھی نیفے میں سرسراتے ہیں
اک خلش ساری رات ازار میں ہے آنکھ بند اور ہاتھ ازار میں ہے

مصحفی نے سیدھے سادے الفاظ میں وہ تمام واردات بیان کی ہے جو درحقیقت اس شخص کو پیش آتی ہے جسکے بستر و پلنگ میں کھٹمل موجود ہوں لیکن انشاء نے اپنی شاعری کا فن بھی دکھایا ہے۔ مصحفی نے اپنی اسی نظم میں ایک مقام پر کھٹملوں کو راون کی اولاد کہا ہے۔ اس سے زیادہ آگے نہیں چلے۔ لیکن انشاء نے اپنی نظم میں اس دانہ سے خرمن پیدا کیا ہے، دونوں کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

مصحفی ان کی کثرت تعداد سے پریشان ہوکر کہتے ہیں:۔

کوئی کیونکر کرے انھوں کا شمار پیدا ہوتے ہیں ایک سے ہزار
ہے بجا بسکہ ہیں زمیں پہ زیاد کہئے راون کی ان کو گر اولاد

انشاء کہتے ہیں:۔

کہتے تھے لالہ دیو کی نندن پٹیاں بن گئیں رکت چندن،
بان ارجن کے بن گئے سب بان اور اودھائیوں نے کھائے پان
کبھی ان کی جو کچھ شکایت کی، ایک پنڈت نے یوں روایت کی
ایک راون کے پوت تھا جیمل اس کی اولاد ہیں یہ سب کھٹمل
کیوں نہ دیں چار پائی پہ ڈنکا چھن گئی ان کی سونے کی لنکا،
راچھسوں کی سی کیوں نہ باندھیں ساکھ ایک سے ہوتے ہیں یہ نوے لاکھ
کیوں نہ ہر فرد ہووے غیرت دار قوم کے اپنے یہ بھی ہیں سردار
لاکھوں پستے ہیں مارے جاتے ہیں پھر وہی ریلا کرکے آتے ہیں،

اس کے بعد کچھ اشعار ہیں جن کے بعد انشاء گریز کرتے ہیں، شاید مصحفی کے لفظ "زیاد" نے ان کے خیال کو مہمیز کیا ملاحظہ فرمائیے:۔

جھوٹ پنڈت کی وہ روایت ہے دو جنوں کی سی ایک حکایت ہے
پر یہی جانتے ہیں اہل یقین ہیں یہ سارے لعین ابن لعین
یا تو یہ ہیں یزید کی اولاد، یا کہ بے شبہ نسل ابن زیاد
جوں جوں مرتے ہیں بڑھتے جاتے ہیں اور لوگوں کو توڑے کھاتے ہیں
کام ہے ان کے ہی مریدوں کا ڈھیر جو گنج ہے شہیدوں کا،

ایسی ہے کھٹملوں کی آئی فوج، کہ سمندر سے جیسے اُٹھے موج
ہوئے یکبار ہاتھی گھوڑے سرخ اور سواروں کے سارے جوڑے سرخ

میر تقی نے بھی کھٹملوں کی شکایت میں زبانِ قلم کھولی ہے۔ ان کی نظم کے بھی چند اشعار یہاں پیش کرنا بے موقع نہیں ہوگا:۔

جنس اعلیٰ کوئی کھولا کھاٹ پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ
کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی
شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں، سر پہ روزِ سیاہ لاتا ہوں،
کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے، سانجھ سے کھانے ہی وہ دوڑا ہے
ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر،، ایک انگوٹھا دکھاوے اُنگلی پر
گرچہ بہتوں کو میں مسل ڈالا پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا،
ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں
ہاتھ تکیہ پہ گہہ بچھونے پر کبھو چادر کے کونہ کونہ پر،
سیکڑوں ایک چارپائی میں، ایک ہتھیلی میں ایک گھائی میں
ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہئے، کب تلک یوں ٹٹولتے رہئے

میر کا آخری شعر مصحفی کے آخری شعر سے ملا کر دیکھئے مضمون قریب قریب ایک ہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مصحفی نے زیادہ واضح کر دیا ہے۔ تینوں شاعروں کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب پر تو درحقیقت یہ واردات گزری جس نے ان سے کھٹملوں کی ہجو کہلا کر چھوڑا۔ مصحفی نے میر صاحب کے تتبع میں طبع آزمائی کی اور مضمون کے ساتھ ہی ساتھ زبان و بیان میں بھی پیروی کی۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے مصحفی کو دیکھ کر انشاء کا بھی دل للچایا کہ کھٹملوں کی برائی کیجائے، چنانچہ انشاء کی مثنوی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اپنے پر گزری ہوئی کوئی واردات بیان کر رہے ہیں بلکہ اپنے مذاق کے مطابق ایک مضمون ان کے ہاتھ آگیا جسے لے اُڑے اور شاعری کا کمال دکھا گئے۔

انشاء کی دیگر ہجویہ مثنویات بھی قریب قریب اسی طرز اور شاعرانہ جودت کی حامل ہیں جو مذکورۂ بالا مثنوی میں پائی جاتی ہیں "مثنوی در ہجو ننھو" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ان مچھروں نے کیا یہ اب کی قہر کہ ہوا زرہ پوش سارا شہر
دیکھئے ان کی ٹک جواں مردی سب پر ایک اپنی پھیردی زردی
مول کی زرد زرد پھلیاں ہیں یا گل اشرفی کی کلیاں ہیں،

مولسریوں کی نیچے دیکھے جب — کھرنیاں سی بکھر رہی ہیں سب
جا کے کوٹھوں کی کوئی دیکھے بہار — زرد چمیلی کے پڑے ہیں ہار
اُڑ گئی وہ سفیدی اور اودی — اب جدھر دیکھو زرد داؤدی
پھر جو شاخوں سے ہر شجر کے اُڑے — تو املتاس ہے کہ پھول جھڑے
ساری دیواروں پر قطار قطار — زرد مرچوں کے سوکھتے ہیں ہار
یہاں جو فوارے اب اُچھلتے ہیں — سونے کی ٹڈیاں اُگلتے ہیں
اب جو خشکہ کوئی پکاتا ہے — سو مزعفر پلاؤ کھاتا ہے
ہو کے بیخ ان بھڑوں کی آئینہ — بن گئی ٹھیک ٹھاک خاگینہ
چاندنی کا جو پھول تازہ ہے — سو وہ اک نرگسی دوپیازہ ہے
زرد رو کاسۂ شراب ہوئے — سب مگر نرگسی کباب ہوئے

انشاء نے ایک ہی مضمون کو مختلف پیرایوں سے باندھا ہے اور تشبیہات کا جو کمال دکھایا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے۔ "مثنوی در ہجو پشہ" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

مچھروں کو ہوا ہے اب کی اوج — دب گئی جن سے مرہٹوں کی فوج
سوکھے سے ہیں کالے کالے ہیں — یہ بھی پر کوئی گھوڑے والے ہیں
بس کہ لپٹے ہی رہتے ہیں ہر دم — حبشی ہو گیا ہے اک عالم
چاٹ لی صاف گلدموں کی دم — رہ گئیں وہ بچاریاں گم سم
بس کہ کافر لپٹ لپٹ جو موئے — تختے صندل کے آبنوس ہوئے
ہوئے مچھر بہت سے جو ساتھی — بتنے بیٹھے سے بن گئے ہاتھی
لوگ بجلی کی طرح ہیں بیکل — چھا گئے مچھروں کے دل بادل
کیچوے تھے سو کالے ناگ بنے — شعلہ منھ سے نکال آگ بنے
اب یہ کیا قہر اے الٰہ ہوا — خون دنیا کا سب سیاہ ہوا
ہر بن مو کی لے چکے ہیں فصد — اور کیا دانے ان کا کیا ہے قصد
بس جدھر دیکھو ان کو ہے ایک راہ — نکلے ہے سب کے دل سے دود سیاہ
خال رخسار نازنیں ہیں یہ — مگس شیر و انگبیں ہیں یہ

آگے کیا لکھے کوئی ان کا بھید
پڑ گئے کاغذوں میں لاکھوں چھید

آگے مچھر جو پھر دو چار ہوئے
حرف بے نقطہ نقطہ دار ہوئے

الغرض قوم یہ بہت بد ہے
نام دیکھو تو کیا مشد دہے

کھانے پینے میں سب دخیل ہوئے
آگے پشہ تھے اب تو فیل ہوئے

سونڈھیں ہیں مثل فیل ان کے پاس
کیوں نہ کھو دیویں سب کے ہوش و حواس

نہیں مچھر یہ فیل خانہ ہے،
کجری بن ان سے سب زمانہ ہے

کن نے رکھا ہے مچھر ان کا نام
ان کو کہئے تو کہئے لشکر شام

"مثنوی در ہجو مگس" کے چند اشعار بھی دیکھ لیجئے:

مکھیاں اب کی یہ بڑھیں بے ڈول
کہ لگا آ کے ایک جی کو ہول،

کس طرح ہو بہار تازہ دماغ
کرتے ہیں آبشار استفراغ

جان کر مکھیوں کو جنس وغل،
سونگھتے ہیں گل اپنی اپنی بغل

لگی یوں کرنے پھول پہ بھن بھن
جس طرح آ چڑھے کسی پہ جن

تاک جتنے تھے یہ ہوئے مبہوت
جس طرح آ چڑھے کسی پر بھوت

مکھیوں کا ہی کارخانہ ہوا
حبشستان سب زمانہ ہوا،

یہ جو دنیا سواد اعظم ہے
اوڑھے اک کالی جا جسم ہے

مکھیوں کا بلند پایہ ہوا،
سایہ سب ان کے زیر سایہ ہوا

قلقل مے کی اڑ گئی وہ ہوا
چائے سے آ کے مل گیا بتھوا

طاق پر ہے دھرا جو شیشۂ مے
لکھی ہے اس کے بھی نصیب میں قے

دیکھ ان کے پروں کی ایک جھلک
مگسی ہو گیا یہ اسپ فلک،

کھلکھلا کر انار جو ہیں ہنسا،
دام میں مکھیوں کی آن پھنسا

اس کی وہ لال لال بتیسی
نہ لگی کافروں کی جو جیسی،

لے کے دانتوں کو سب سیاہ کیا
اور ہونٹوں کو سب تباہ کیا

ایک لکھوٹا سا جم گیا بس خیر
باغ میں یہ ہوئی عجائب سیر

ایک ذرا اس کو کیجئے آپ نگاہ
کس طرح کی دھڑی جمائی ہے

منہ میں کھی نے ٹھونس دی مستی
کون ایسی بھلا ہو چھتیسی،

مندرجۂ بالا اشعار کے مطالعہ سے واضح ہو گیا ہوگا کہ جہاں مثنوی کے قواعد کی پابندی انشاء نے ملحوظ رکھی ہے شاعری کے زیور مثلاً تشبیہ، استعارہ، حسن تعلیل اور مضمون آفرینی وغیرہ سے بھی خوش اسلوبی سے کام لیا ہے۔ یہ نہ ہوگا اگر چند اشعار مصحفی، میر حسن اور میر تقی کی بعض مثنویات میں سے بھی پیش کئے جائیں ؟

انشاء نے علٰحدہ علٰحدہ ایذا رساں جانوروں کی ہجو کہی ہے لیکن متذکرہ بالا ہر سہ شعراء نے اپنے مسکونہ مکانات کے سلسلہ میں اس قسم کے حشرات الارض کو بھی لے ڈالا ہے پہلے مصحفی کی شکایت سنئے :

دل کو کاوش ہی رات اور دن ہے — بسکہ پشوں کی اس میں بھن بھن ہے
الغرض اس میں مجھ کو ہر صورت — رہتی ہے موذیات سے صحبت
کبھی چیونٹی بدن کو کاٹے ہے — کبھی دیمک ہی پائے چاٹے ہے
چارپائی جو ہے ہمارے پاس — کھٹملوں کی رہے ہے اس میں مواس
گھونس نے کر دی ہے زمیں سوراخ — موشک کور پر ہے عرصہ فراخ
گر نظر جائے جانب دیوار، — نظر آتی ہے چیونٹیوں کی دیوار
گھن نے پایوں کے تئیں جو ہے چاٹا — خوردہ اس کا چنے کا ہے آٹا

میر حسن صاحب کا شکوہ بھی ملاحظہ فرمائیے چیونٹیوں نے ان کا ناک میں دم کر دیا تھا :

نہ تو بچھو نہ کھٹمل اور نہ مار، — مور نے سب کو کر دیا مسمار
اپنی بانی پہ جب یہ آتی ہے — بوٹیاں توڑ توڑ کھاتی ہے
مردم آزاری پر جو باندھی کمر — تو نکالے ہیں چیونٹیوں نے پر
دیکھکر ہم کو اس جگہ پہ نحیف — پہلوانی کرے ہے مور ضعیف
رات دن ہم سے یہ بگڑتی ہیں، — مورچہ باندھ باندھ لڑتی ہیں،

میر تقی میر چھپنگروں اور مکڑیوں سے نالاں ہیں اور اپنی مصیبت کا رونا اس طرح روتے ہیں :-

پھونس کچھ ہے کہیں سو آٹا ہے — بانس کو چھپنگروں نے چاٹا ہے
اُڑ گئی گھاس مٹی ہے دالا — ہے جو بندھن سو مکڑی کا جالا

انشاء کی عاشقانہ اُردو مثنوی میں کوئی ندرت نہیں ہے بہر حال کہیں کہیں سے اس کے بھی چند اشعار پیش کئے ہیں زمانہ نافرجام کی شکایت دیکھئے :-

کروں کیا جور گردوں کی شکایت — جہاں دیکھو اسی کی ہے حکایت
نہیں یہ دیکھ سکتا خانہ آباد، — کہ ہو کوئی کسی ڈھب سے کہیں شاد

ستائے بن ہمیں کیا کام اس کو — کہاں بن دکھ دئے آرام اس کو
نہیں معلوم منظور اس کو کیا ہے — بُری چتون سے کافر دیکھتا ہے
کمر بس ظلم پر اس نے ہے باندھی — یہ ظالم ہے اُڑا دینے کو آندھی

ساقی سے اس طرح خطاب کیا ہے :

شراب تند دے ایسی ہی ساقی — کہ جس سے غم رہے مطلق نہ باقی
گلابی لاکے رکھ دے وہ مرے پاس — کہ ہو دلہن پنے کی جس میں بو باس
چمک جاوے جو میرا جوہر عقل — تو میں تجھ سے حکایت اک کروں نقل

عاشق و معشوق کی پہلی ملاقات اور محبوبہ کے حسن کا بیان اس طرح کیا ہے :-

گئی آنکھوں تلے بجلی سی اک کوند — سمند ناز نے ڈالا اسے روند
کہا دل نے مرے دیکھی جو وہ مانگ — کہ ہے یہ رات آدھی کچھ دُعا مانگ
حواس و ہوش میرے ہو گئے تار — ہوا میں مانگ چوٹی میں گرفتار
بہم آنکھوں سے آنکھیں لڑ گئیں غیر — عجائب نرگستاں کی ہوئی سیر
وہ شوخ و شنگ دیدہ اس پرن کے — کہ ہو جس طرح دو بچے ہرن کے
نظر آیا وہ کھڑا سیب کا سا — بندھا یاں ڈول کچھ آسیب کا سا
یہ رخساروں میں اسکے فربہی تھی — ہوئی جس سے خجل اکثر بہی تھی
نگاہ مست تھی ایسی ہی بیباک — کہ بس دیکھے جدھر باندھے ادھر تاک
کہوں اس کی جبیں کو کس طرح چاند — کہ اس سے لاکھ حصّہ ماندھتا چاند
سہانا تھا کچھ ایسا روپ اس کا — کہ سایہ چاہتی تھی دھوپ اس کا
جٹی دونوں بھویں یہ داد بیداد — کہ ہو دلچسپ جیسے شعر اُستاد
کروں کچھ بھی جو تعریف دُرگوش — تو اُڑ جاویں صدف کے سنتے ہی ہوش
گلاوٹ بازوؤں کی چشم بد دور — وہ دونوں مچھلیاں جیسی سفنقور
نہ کیونکر اس کے خود بینی ہو ایسی — کہیں دیکھی بھی ہے بینی ہو ایسی
پھڑک نتھنوں کی پھر ایسی ہی اچھی — تڑپ جوں تیرنے میں جائے مچھلی
یقیں ہو اس کو جو دیکھے وہ پستاں — کہ بے شک یہ ارم کا ہے گلستاں
بنے دو برج سونے کے یہاں ہیں — کسوٹی کے کلس ان پر عیاں ہیں،

غلط فہمی تھی کہنا یہ بڑی بات — عبث ضایع ہوئی ناحق کو اوقات
یہ کہنا تھا کہ دو سونے کے تھالے — لگائے آنکھ جن پر تھے اُچکے،
نہ جی الماس اور نیلم کے کنے — بہم چھوٹے بڑے تھے یا اکنے
زلیں تھا صاف سینہ پیٹ بھی صاف — بدن آئینہ ساں برّاق شفاف
شکم پر رونگٹوں کا ذکر کیا تھا — فقط وہ عکس خوبی کا پڑا تھا،
ستارہ سی دہکتی تھی پڑی ناف — بھلا کوئی کرے کیا اس کا اوصاف
وہی تو حسن کے چشمے کی تھی سوت — نہ تھی وہ ناف تھی ایک جاگتی جوت
یہی کہتی تھی اس کو دختر رز — کہ ہے یہ تو لعینہ ہائے ہوز
کروں کچھ اور اعضا کا تو کیا ذکر — کہ ناحق کی اتنی ہے کہاں فکر
کہے دو شعر لیکن فارسی ہیں — کہ سچ مچ حسن کے وہ آرسی ہیں
زہے مضمون کی عالی دماغی — چڑھا دیں بلبلیں جن کو چراغی
مپرس از بند شلوار از دگر ہیچ — حکایتہاست اینجا پیچ در پیچ
بناف داں گرہ کن چشم خود باز — کہ زیر مہر دارد برہ ناز
اسی میں آ گئے مضمون سارے — لگے ہر سمت سے ہونے اشارے

مندرجۂ بالا اشعار سے واضح ہے کہ اس میں لکھنویت حد درجہ غالب ہے۔ رعایت لفظی کی بھرمار اس امر کی طرف خاص طور پر اشارہ کر رہی ہے کہ "گلزار نسیم" کے لئے زمین اسی زمانہ میں طیار ہونا شروع ہو گئی تھی۔

اُردو میں ایک اور مختصر مثنوی "مرغنامہ" کے نام سے ہے اس میں مرغ بازی کی ثنا و صفت کی گئی ہے لیکن وہی اپنے طبعی تمسخر کے ساتھ تمام مثنوی رعایات لفظی سے پر ہے۔ چند نمونے پیش ہیں:

حمد

حمد ہے فرض اس کی وقت سحر — جس نے کاٹے ہیں مرغ روح سکے پر
تن کے کھانچہ میں کر دیا سہ بند — کہ وہ یک چند واں رہے خورسند

نعت

کر ثنائے رسول راہ نما، — جس کی نعلین کا ہے سایہ ہما
صلوٰۃ اس پہ بھیجئے جا دید — ہے جو اک آسماں پہ مرغ سفید
گر حمایت کرے نہ اس کی آل — نہ جمیں مرغ عقل کے پر و بال

مُرغوں کی تعریف

مثلِ فولاد مُرغ ہیں اپنے — داد بیداد مرغ ہیں اپنے
پہلوانوں کی ہیں انھوں میں صفات — لات وعزا کو توڑے انکی لات
پاس اپنے جو مرغ ہے جاوا — ہے وہ اسفند یار کا باوا

فارسی زبان میں انشاؔ کی تین مثنویاں قابل ذکر ہیں (۱) مثنوی شیر برنج (۲) مثنوی شکارنامہ اور (۳) مثنوی بے نقط پہلی مثنوی متصوفانہ ہے جس میں مثنوی مولوی معنوی کا تتبع کیا ہے۔ وہی بحر ہے اور اسی طرح حکایات و امثلہ سے بھی کام لیا گیا ہے مولوی محمد حسین آزاد نے اس مثنوی کے بارہ میں لکھا ہے۔ "نہیں معلوم ہوتا کہ تمسخر کرتے ہیں یا تتبع کرتے ہیں کیونکہ زبان کہیں فقط روزمرہ ہے کہیں عالم جبروت ولاہوت سے پرے کے الفاظ لاکر لفاظی کرتے ہیں اور جابجا عربی زبان کے کہیں شعر کہیں مصرع ہوتے جاتے ہیں مضامین فقط ظرافت کی باتیں اور حکایتیں ہیں۔ انھیں نظم کرکے معرفت و طریقت میں لاتے ہیں، کھیر میں نون ڈال کر تصوف کو تمسخر کردیا ہے۔" مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کے اشعار بعض مقامات سے پیش کردئے جائیں۔ فلسفیوں اور منطقیوں کو نصیحت فرماتے ہیں:

تا بکے باشی چنیں زار و زبوں — علم میخوانی پئے دنیائے دوں
از مقولات آوری تا کے سخن — اے حکیم از بحر خود فکری بکن
بدتر از مشکل ہماری اے عبوس — قید خواہی گفت از شکل عروس
ز اہل اشراق آوری تا کے دلیل — چند مشائیں صفت باشی ذلیل
چیست از بعد مجرد حاصلت — میشود آخر جہنم منزلت،
بیچ از صغرا و از کبریٰ مخواں، — از نتیجہ خواہی آمد در فغاں
از دلیل انی دلے چہ سود — تب و قل الحمدللہ الودود،
از ہیولا عقدۂ نکشایدت — شوق و ذوق ابطال خبر سنجایدت
آخر ایں تفکیک اجزائے رجا — آسیا سامی کند فخر ترا،
ایہا المسجون فی قید الذلل، — لاتقف وامکن علی راس الجبل
رند مشرب باش و عاشق پیشہ شو — فارغ از افکار و از اندیشہ شو

ایک جگہ اور اس طرح پند و عظمت کے دریا بہائے ہیں:-

ایک گستردی بساط عنکبوت — دام تلبیس از پئے تحصیل قوت
تار و پود ہستیت بگستنی است — ایں زمان صید گیری اندکے است

بس نگسہا طمعہ گر دیدہ است — دل ضعیفاں راز تو رنجیدہ است
تا کجا ایں سعی بیجا بہر صید — ایں تکبر تا کجا ایں مکر و شید
تا کجا باشی میان مزبلہ — بہر شیطاں ورد خود کن ہو قلہ
قل ہو اللہ احد آغاز کن، — ذکر الا اللہ را دمساز کن

ایک اور مقام سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :-

خویش را در فکر رازق سازگم — خواندہ باشی فی السماء رزقکم
گفت خود روزی رسانِ انس و جاں — رزقہاء مقسوم شد در آسماں
ایں کفالت را نگر اے ذوفنون — واو عطف آورد بر ما توعدون
ماء موصول انچہ باشد فارسیش — سر سری آنرا بداں در زعم خویش
جامعیت لاحق اینمیعنی است — گر نہ فہمی وائے بر ایں فکری است
حمد شی را حاوی است ایں لفظ ہا — از فیوض او بود نشو و نما
جملہ افعال و صفاتت اے پسر — شد مقدر بہر تو از خیر و شر
بہرۂ داری گر از ترکیب نحو — خویشتن را خود مکن در ہو محو
تا برویت منکشف ایں پردہ شد — میرسد چیزے کہ وعدہ کردہ شد
پس چہ باشد حاصل از سعی و تلاش، — خود بفہم اے نکتہ فہم خوش معاش،
من بفرماں خدائے خود شام — فای تعقیب است پس دادستم
قصہ آنرا شنیدی کو مدام — ذکر ما ابلیس خواندے صبح و شام
چلہ تا بگذشت شیطاں شد پدید — با عصا و جبہ درویش سفید
گفت اے شخص انچہ گوئی حاضرم — با تو شد خوشنود اینک خاطرم
گفت من ز افلاس نالاں بودہ ام — سخت با حال پریشاں بودہ ام

اس حکایت کا خاتمہ اِن اشعار پر کیا جاتا ہے :-

الاماں از مکر ابلیس الاماں، — الاماں از زور تلبیس الاماں،
ایں خطرہا و وساوس با نیاز — جو نجات از لطف حق کردگار
ایں حکایت یاد دار اے پر بصر — تو ازیں تزویر شیطاں درگزر
پختنِ شیر و برنجتِ خوب نیست — نزدِ اہلِ وجد ایں مرغوب نیست

چیست ایں شیرو بربخت اے فتا، خواستی تائید از غیرِ خدا

اِن اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آزاد کی رائے اس مثنوی کے بارہ میں خلاف واقعہ ہے۔

دوسری مثنوی نواب سعادت علی خاں کے شکار کے بیان میں ہے اس کے اشعار سے فردوسی، طوسی کے تتبع کا اظہار ہوتا ہے۔ زبان کی شیرینی اور ترکیب کی چستی اس مثنوی کی خصوصیات ہیں۔ انشاء کی جبلی طبیعت اور خوشگوئی نے مثنوی کے حسن میں مزید چار چاند لگا دئے ہیں۔ مختلف مقامات سے اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

شکار نامہ

اینکہ کنوں میگذرد در شمار بست فزوں از دو صد و یک ہزار
ساختہ در خامۂ انشاء وطن چند ہزار آہوئے مشکِ ختن،
بہ کہ کنوں صید مضامیں کنم بارگیِ ناطقہ را زیں کنم،

در تمہید کلام

از مددِ شیرِ خدائے ودود صورتِ عنقائے طرب پر کشود،
ذہن و ذکا رقص چو طاؤس کرد مست شدہ آہوئے صحرا نورد
طائرِ اقبال بہ نشو و نما سایہ فگن گشتِ بانِ ہما،
خیزد لا صبح سعادت دمید فصلِ گل و بادِ بہاری وزید

در تعریف حضور پر نور

اشرفِ خیلِ وزرائے زماں، ناظم ملکِ ہمہ ہندوستاں،
صفدر و منصور و سخی و شجاع بست کمر از پئے قتلِ سباع
تاختہ از خانہ بہ عزم شکار، کرد برو برج اسد جاں نثار

در تعریف خیمہ و خرگاہ و نوبت و نقارہ وَمَا یتعلقُ بذٰلک

تا کہ نبرد خیمۂ زریں طناب آمدہ در برجِ حمل آفتاب
گشتِ ز نقارہ صدائے بلند زندہ بماں زندہ بماں بے گزند
دز دہلِ نقرہ در آمد بجوش تا بتواں تا بتواں، ہاں خروش
حلتِ صید است در آئینِ من، دینِ من و دینِ من و دینِ من
واشدہ زیں ساں دہنِ کرنا با دیدہ - با دیدہ - با دُعا

دشمن ایں خانہ جگر خوں بود — دوں بود و دوں بود و دوں بود
عیشِ بروں از حدِ اندازہ شد — رسمِ کہن از سرِ نو تازہ شد
غلغلۂ کوس بکیوانِ رسید — آب شدہ زہرۂ دیو سفید
کوہ چو غرّیدنِ پیلش شنید — صورتِ خرطوم دلے از دور دید
گفتِ بروں آمدہ از زیرِ ابر — صور اسرافیل پئے صید ببر
دقتِ ہماں است کہ سیمرغِ قاف، — بگذرد از گلۂ لاف و گزاف،
آنچہ ندیدست فریدوں بخواب — جملہ مہیا است درادر رکاب
چونکہ بدید ایں ہمہ عظم و شکوہ — لرزہ بر افتادہ براندام کوہ

تاریخ

فوجِ ظفر موج ہایں عزّ و جاہ — گرد رسانید چو بر اوجِ ماہ
شوکتش انشاء بخط زر نوشت — فقرۂ تاریخ مظفر نوشت ۱۲۳۰

تعریفِ اسپ

خود چو بر اسپ عربی برنشست — آمدہ بر فوجِ غزالاں شکست
اسپ چہ اسپ اشہبِ بادِ صبا — اسپ بگوشہ رُخِ گلگونِ قبا،
اسپ بایں شوخیِ دلچسپ کو؟ — حور بگو - اسپ بگو - اسپ کو؟
اسپ بداں لمعۂ شرق است ایں — اسپ کجا چشمکِ برق است ایں
پیش رو جودتِ طبعِ سلیم — گام نہد بر برِ دوشِ نسیم
زیبِ دہ کوہ و بیابانِ نجد، — قیس اگر بنگرد آید بہ وجد
سیرت لیلےٰ رسدش در خیال — باہمہ چالاکی و حُسن جمال
بیندش ار نادرِ کشورستاں — وصف کند باہمہ ایرانیاں

تیسری مثنوی کی یہ کچھ کم خصوصیت نہیں ہے کہ اس میں کوئی حرف نقطہ دار نہیں آیا ہے سرخیاں تک بے نقطہ ہیں مثلاً (۱) لوحہ در حمد مالک الملک (۲) لوحہ در مدح سرورِ کل (۳) لوحہ مدح سوار دلدل (۴) لوحہ در مدح مالک گاہ لوحۂ در مدح حاکم عصر —— مثنوی کے خاتمہ پر ایک مناجات ہے وہ یہاں پیش کی جاتی ہے :-

عمر صد سالہ دہ الٰہم — اللّٰہم ارحم ارحم ارحم،
اسلام دہ و کمال آرام — آور عسلِ مرام در کام

حاصلِ ہمہ ام سرور گردد ہم سرد و دار دور گردد،
در دورۂ دہر دار مرور دہ در ارحم امارد و حور،
در عالم دار کردگار را، او لادم را و سادہ آرا،

ایک اور مختصر فارسی مثنوی شرح "مائۃ عامل" ہے۔ اس میں عربی زبان کے قواعد سمجھائے گئے ہیں۔ نمونہ حاضر ہے:-

در معارف پنجگانہ

بدانکہ پنج معارف بود میاں عرب نیافت است کسے غیر شاں در استقرا
بگوی مضمر و مدخول لام و ہم علم است دگرچہ مبہم ایا عقل و ذہن را ملجا
مضاف سوئی ہماں ہر چہار نیجم شان کتاب نیست بود ایں کلید گنج انشاء

رحمت نبی خاں ام۔ اے (علیگ)

نگار کے پرانے پرچے

۲۶ء جنوری = ۱۲ر — ۳۱ء جولائی، اگست فی پرچہ ۸ر - اکتوبر تا دسمبر فی پرچہ ۸ر — ۳۲ء فروری، مارچ فی پرچہ ۱۲ر - مئی، جون، جولائی فی پرچہ ۸ر - ستمبر و نومبر فی پرچہ ۸ر — ۳۴ء اکتوبر عہ۔ ۳۷ء فروری عہ۔ - جولائی ۸ر - اکتوبر عہ۔ — ۳۸ء فروری ۸ر، اپریل تا دسمبر فی پرچہ ۸ر — ۳۹ء فروری تا جولائی - اکتوبر، نومبر فی پرچہ ۸ر — ۴۰ء فروری تا دسمبر (جون، جولائی، اگست) نہیں ہی) فی پرچہ ۸ر — ۴۱ء مارچ تا دسمبر (اگست نہیں ہے) للعہ — ۴۲ء مارچ تا مئی فی پرچہ ۸ر - اگست، ستمبر، اکتوبر و نومبر فی پرچہ ۸ر — ۴۳ء مئی ۱۲ر - ستمبر تا دسمبر فی پرچہ ۱۲ر — ۴۴ء مئی تا دسمبر مسلسل ۱۲ر فی پرچہ ۴۵ء اپریل ۸ر - جون، جولائی فی پرچہ ۱۴ر - اگست تا دسمبر ۸ر فی پرچہ — ۴۶ء اپریل تا اگست فی پرچہ ۸ر - ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر فی پرچہ ۱۲ر - (مکمل فائل ۴۶ء - عہ۔)

مینجر نگار لکھنؤ

عُرفی شیرازی

فارسی ادب کی تاریخ میں جو سچی شہرت عرفی شیرازی نے حاصل کی اس کی مثال بہت ہی کم ملے گی، اس کی شہرت صرف ہندوستان تک محدود نہ تھی بلکہ ترکی میں بھی اس نے اچھا خاصہ نام پیدا کرلیا تھا۔ گب لکھتا ہے کہ جامی کے علاوہ جن فارسی شعرا کا اثر ترکی ادبیات پر بہت گہرا پڑا وہ فیضی اور عرفی تھے۔ ضیا پاشا نے جو منظوم مقدمہ "خرابات" پر لکھا ہے اس میں عرفی اور فیضی کی بہت تعریف کی ہے۔

نام و نسب تذکروں میں عرفی کے نام کے متعلق اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عبدالباقی نہاوندی (صاحب مآثر رحیمی) نے جو خود عرفی کا معاصر ہے اور جس نے اس کی زندگی کے دلچسپ واقعات بہم پہونچائے ہیں، اس کا نام خواجہ سیدی محمد لکھا ہے۔ دوسرا معاصر تذکرہ نویس عبدالنبی (صاحب میخانہ) ہے جس نے شاعر مذکور کے حالات خود اس کے خالو شمس الانام شیرازی سے سُن کر قلم بند کئے تھے۔ اس نے اس کا نام محمد حسین لکھا ہے، بقیہ تمام تذکرہ نگار جن میں تقی اوحدی (صاحب عرفات) اور تقی کاشی مولف خلاصۃ الاشعار ہیں (اول الذکر کی عرفی سے دوستی کا یہ عالم تھا کہ شیراز کے تمام شعرا اس پر حسد کرتے تھے) اس بات پر متفق ہیں کہ اس کا نام جمال الدین سیدی ہے۔

مآثر رحیمی کا جو نسخہ بانکی پور کے کتاب خانہ میں ہے اس میں "خواجہ" اور "سیدی محمد" کے درمیان کچھ فصل ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کاتب کو اس کے نام میں شبہ تھا۔ لیکن فہرست کتاب خانہ مذکور میں ایک جگہ اس کا نام "مولانا سید محمد" اور دوسری جگہ خواجہ سیدی محمد ہے جو مآثر رحیمی سے ماخوذ ہے، شعر العجم میں "مآثر" اور عرفات کے بیان کی تطبیق اس طرح کی گئی ہے کہ "محمد" اس کا نام اور جمال الدین، اس کا لقب بتایا گیا ہے۔ حالانکہ عرفات میں نہایت واضح طور پر اس کا نام "جمال الدین سیدی" لکھا ہوا ہے، صاحب مے خانہ نے جو اس کا نام قلم بند کیا ہے وہ کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ مشہور محقق ہراون نے عرفی کا نام جمال الدین محمد (بہ اضافہ محمد) اور بعض دوسرے تذکروں میں صرف جمال الدین (بہ حذف سیدی) پایا جاتا ہے۔

چونکہ عرفی کے متعلق سب سے زیادہ مستند قول تقی اوحدی کا ہے جس کی عرفی سے صرف ملاقات ہی نہ تھی بلکہ دونوں تقریباً پورے پورے ۱۴ سال (۹۸۹ سے ۹۹۳ تک) ساتھ ساتھ رہے اور عرفی کی وفات کے بعد اس کے بعض عزیزوں کے ساتھ تقی نے اسکے اشعار پر اشعار کہے، اور اس کے انتقال کی تاریخ نظم کی، اس لئے مآثر رحیمی اور میخانہ کے اقوال مستند قرار نہیں پا سکتے۔

عرفی کے نام کے متعلق جو اشتباہ پیدا ہوگیا ہے اس کی بظاہر یہ وجہ ہے کہ اس کا نام وہی قرار پایا جو اس کے دادا کا تھا۔

اسی بنا پر بعض تذکرہ نویسوں نے اس کے اور اس کے دادا کے نام میں فرق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً مؤلف نشترِ عشق نے اس کا نام جمال الدین اور دادا کا نام کمال الدین لکھا ہے۔

ہمیشہ بہار میں اس کا نام "سیدی" کے بجائے "صیدی" درج ہے۔ اس کو بہت آسانی سے کتابت کی غلطی پر محمول کیا جا سکتا تھا۔ لیکن میخانہ میں "صیدی" اس کا اول تخلص بتایا گیا ہے۔ اس سے اس کو کتابت کی غلطی کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ لفظ "سیدی" سید سے علاقہ رکھتا ہے یا اس کا کوئی خاندانی نشان ہوگا کیونکہ اس کے دادا کے بھی نام کے ساتھ یہ لگا ہوا تھا۔

تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ عرفی کے باپ کا نام زین الدین علی بلوی ہے، صرف میخانہ میں اس کا نام خواجہ بلوی لکھا ہے۔ شعر العجم میں زین الدین علی بلوی کے بجائے زین الدین بلوی ہے، "بلوی" کتابت کی غلطی ہے اور "علی" کا حذف غیر شعوری طور پر ہوا ہے، چند دوسرے تذکروں میں بھی یہ حذف موجود ہے۔ بانکی پور کی فہرست میں بلوی اور علی دونوں لفظ محذوف ہیں، بہرحال یہ مسلم ہے کہ اسکے باپ کا پورا نام وہی ہے جو ادھر مذکور ہے "بلوی" کے متعلق یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ تخلص رہا ہے۔ خاندانی لقب نہیں معلوم ہوتا۔ تعجب ہے کہ پروفیسر براؤن نے تمام ماخذ کے خلاف عرفی کے باپ کا نام بدرالدین لکھا ہے جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

بقول مؤلف میخانہ خواجہ بلوی کا مولد شیراز ہی تھا۔ "در دفتر خانہائے شاہی بہ شغلے از اشغال حکام آں جا اشتغال داشت" مآثر رحیمی میں نہایت واضح طور پر لکھا ہے کہ عرفی کا باپ شیراز کی دارالحکومت میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز تھا اور چونکہ ایران میں غیر مذہبی محکمۂ جات کو عرف کہتے ہیں اسی مناسبت سے اس نے اپنا تخلص عرفی رکھا۔ لیکن میخانہ میں لکھا ہے کہ عرفی بچپن میں مولانا صیدی کے لقب سے ملقب ہوا اور اول جوانی ہی سے مشق سخن شروع کی، چونکہ اس کے اشعار بہت اعلیٰ درجہ کے ہوتے تھے اس لئے اس کے ساتھیوں نے اس کو عرفی تخلص عنایت کیا۔

اس کے دادا کے نام کے متعلق کسی قسم کی اختلاف رائے نہیں۔ اُن کا نام جمال الدین سیدی المعروف بہ "چادر باف" تھا یہی نام اس کے ہونہار پوتے کا بھی تجویز ہوا۔ چادر باف کے لقب سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید اس کے خاندان کو "چادر بافی" سے کسی قسم کا علاقہ رہا ہو۔

عرفی نے اپنے کلام میں جا بجا اپنے نام و نسب پر فخر کیا ہے کیونکہ برخلاف عام شاعروں کے وہ ایک معزز خاندان کا رکن تھا چنانچہ لکھتا ہے:

ایں جوہر ذات از شرفِ نسبت آباست — سوداست بہ ابر ایں دُر اگر چہ سرِ یَم را
ہر چند کہ در کشمکش جاہ و مناصب — گم نام نمودند ہمہ دودۂ ہم را
از نقش و نگار در و دیوار شکستہ، — آثار پدید است صنادید عجم را
تا گوہر آدم نسبم باز نہ ایستد — زیبائے خود ار بشمرم اصحاب کرم را
اما نبود وصمۂ اضافی ہنر ذات — ایں فتوتی ہمت بود ارباب ہمم را
ایں برق سحابت کہ جہد از گہر من، — مدح است ولے گوہر ذاتِ اب و عم را

وصف گل و ریحاں بہ ہوا باز نہ گردد ہر چند ہوا عطر دہد قوتِ شم را
المنۃ للہ کہ نیازم بہ نسب نیست اینک بہ شہادت طلبم لوح و قلم را

شیراز، عرفی کا بھی مولد تھا اور اس کے آبا و اجداد کا بھی، چنانچہ لکھتا ہے:-

نازش سعدی بہ مشت خاک شیراز از چہ بود گر نہ می دانست باشد مولد و ماوائے من

البتہ اصفہان میں اس کے بعض عزیز موجود تھے چنانچہ انھیں کے ساتھ تقی اوحدی اصفہانی نے عرفی کے اشعار پر اشعار لکھے تھے

پیدائش عرفی کے بچپن کے حالات کسی تذکرہ میں نہیں ملتے۔ نہ اس کا سنہ پیدائش کسی نے لکھا۔ اس لئے محض دوسرے واقعات سے اسکی پیدائش کا سال نکالا جائے گا۔ یہ مسلم ہے کہ اس کی وفات ۹۹۹ھ میں ۳۶ سال کی عمر میں واقع ہوئی اس لحاظ سے اسکی پیدائش کا سال ۹۶۳ھ قرار پاتا ہے۔ اس سلسلہ میں عرفات العاشقین کا ذیل کا قول جانچنا ضروری ہے۔[1]

"راقم این مقال در عنفوان حال چوں در جادۂ شانزدہ سالگی قدم وجود در نہادم از اصفہان کہ مولد و موطن اصلیت بود متوجہ شیراز شدم کہ منزل آبا و اجداد بود، و دراں جا بہ خدمت و صحبت مولانا عرفی رسیدم پنج سال قبل ازاں کہ وے متوجہ سفر ہند شود، اکثر اوقات در ملازمت او شعرائے دیگر کہ مجتمع بودند۔۔۔۔ بسیار از بابا فغانی وغیرہ طرح می شد و دراں اثنا مباحثۂ وے و مولانا وحشی مباحثات غائبانہ واقع شد و دراں وقت سن وے تخمیناً بہ سرحد سی سالگی رسیدہ بود و اتحاد وے با مخلص بسرحدے بود کہ اکثر شعرا در رشک بودند۔"

صاحب عرفات کی پیدائش ۹۶۳ھ میں ہوئی تھی، اس حساب سے ۹۸۹ھ میں وہ شیراز آیا ہوگا اور وہاں وہ ۴ سال یعنی ۹۹۳ھ تک مقیم رہا۔ صاحب خلاصۃ الاشعار نے عرفی کے ورود ہند کی تاریخ ۹۹۴ھ لکھی ہے اس لحاظ سے بھی عرفی اور تقی اوحدی کی ملاقات کا سال ۹۸۹ھ قرار پاتا ہے، بہرحال ۹۹۳ھ میں عرفی کی عمر ۳۰ سال کی ہوتی ہے اسلئے اسکی تاریخ پیدائش ۹۶۳ھ صحیح طور پر قرار پاتی ہے۔

عرفات کی مذکورۂ بالا عبارت صاف نہیں ہے۔ ایک بات دوسری بات سے اس طرح ملی ہوئی ہے کہ دونوں کو الگ کرنا دشوار ہے، اس عبارت کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ۹۸۹ھ میں جب مولف عرفات شیراز آیا تو یہاں عرفی موجود تھا۔ اسکے پانچ سال بعد وہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔ ان ایام میں اکثر شاعروں سے مباحثہ رہتا تھا۔ وحشی یزدی سے بھی غائبانہ اور تحریری مباحثے ہوئے۔ ان دنوں اسکی عمر تقریباً ۳۰ سال کی تھی اور اس کی اور مؤلف کی دوستی قابل رشک تھی۔

وحشی کا انتقال ۹۹۱ھ میں ہوا ہے، اسوقت عرفی کی عمر ۲۸ سال کی تھی۔ "دراں وقت" کا مطلب ۹۹۲ اور ۹۹۳ ہجری سے ہے۔ اس وقت عرفی کی عمر ۳۰ سال کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

قیام شیراز بہت کم شاعر ایسے ہیں جن کو تلاش علم، تلاش معاش اور تلاش ممدوح کے لئے سفر نہ کرنا پڑا ہو عرفی بھی اس کلیئے سے مستثنیٰ نہیں تھا، البتہ چونکہ شیراز دارالعلم و دارالفضل تھا اس لئے اسے تلاش علم میں دوسری جگہ جانے کی ضرورت

---

[1] ورق ۵۰۲، ۵۰۳ (نسخۂ بانکی پور)

لاحق نہ ہوئی چنانچہ تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ عرفی نے اپنے ہی وطن میں کسب علوم کئے، وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔

اس نے اولاً عربی صرف و نحو، منطق و عروض کی طرف توجہ کی اور اس میں خاصی استعداد بہم پہونچائی، مولف بہارستان سخن نے لکھا ہے کہ معمولی علوم کے علاوہ مصوری و نقاشی میں بھی مہارت تامہ حاصل کی تھی۔

عرفی نے جس ماحول میں ہوش سنبھالا وہ سیاسی اعتبار سے بہت اہم تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی ۲۱ سال شاہ طہماسپ (۹۳۰ - ۹۸۴ ہجری) کے عہد حکومت میں گزارے، اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اس کا وطن شیراز اس کے قیام ایران یعنی ۹۹۴ کے ۵ سال بعد تک صفویہ کے قبضہ میں براہ راست نہیں آیا تھا بلکہ سرکش سرداروں کی حکومت کا جزو تھا۔ شاہ اسماعیل بانی سلطنت صفویہ (متوفی رجب ۹۳۰) کا تمام زمانہ لڑائیوں میں صرف ہوا تھا۔ شاہ طہماسپ کا بھی بیشتر حصۂ زندگی اسی طرح گزرا، اس نے ترکوں کے ساتھ مسلسل جنگیں کیں۔ ازبکوں کے ہاتھوں اسکو بے حد پریشانی اٹھانا پڑی۔ گرجیوں کے ساتھ جو اس نے لڑائیاں کیں اس میں طرفین کا بہت نقصان ہوا۔ شروانیوں سے اس کی پرخاش جاری رہی، خان احمد والی گیلان سے برسر پیکار رہا۔ تبریز کے شورہ پشتوں کو زیر کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا اٹھایا۔ علاوہ ازیں وہ اپنے خانگی اور خاندانی تعلقات کے بارہ میں بھی بڑا بدقسمت تھا۔ اس کے بھائی سام مرزا نے اس کے خلاف بغاوت کی اور دوسرا بھائی القاص بھی باغی اور غدار ثابت ہوا اور قلعہ قہقہہ میں بند کر دیا گیا۔

مختصر یہ کہ شاہ طہماسپ نے اگرچہ ۵۰ سال سے زاید حکومت کی لیکن اس کو کبھی یکسوئی و اطمینان نصیب نہ ہوا۔ مگر اس نے سلطنت صفویہ کی جڑ مستحکم کر دی، دول خارجہ پر اپنا رعب بٹھا دیا اور اندرونی فتنہ و فساد کا سدباب کر دیا۔ ان وجوہ سے علوم و فنون کی ترقی کے موقع نکل آئے۔

شاہ طہماسپ کے مرتے ہی ایران میں کچھ دنوں کے لئے مستقلاً فتنہ و فساد کا دروازہ کھل گیا۔ اس کے انتقال پر اس کے ۹ بیٹوں میں تخت کے لئے جھگڑا ہوا، اس میں اسماعیل کو کامیابی ہوئی اور وہ اسماعیل ثانی کے لقب سے تخت ایران پر متمکن ہوا۔ اسکا زمانہ "خونین دور" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اولاً اس نے اپنے دو بھائیوں کو قتل کرایا پھر شاہزادوں کے قتل کا بازار گرم کیا۔ دس ماہ کے اندر ۶ شہزادے موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ صرف خوردسال شاہ عباس میرزا جو شاہ عباس اعظم کے نام سے ایران کا سب سے زیادہ زبردست حکمراں گزرا ہے، باقی بچا۔ اس کے اس طرح بچنے کو اسکندر منشی[1] معجزہ اور تائید غیبی سمجھتا ہے۔ ایک سال چار ماہ کے بعد شاہ اسماعیل کا انتقال ہوا اور جیسی اس کی زندگی شرمناک تھی ویسا ہی اس کا خاتمہ بھی ہوا۔ اس کی وفات پر محمد خدابندہ تخت نشین ہوا تخت پر بیٹھتے ہی اس نے پری خاں خانم کو جس نے شاہ طہماسپ کے انتقال کے وقت فتنہ و فساد میں نمایاں حصہ لیا تھا، معہ اسکے ماموں اور شاہ اسماعیل کے خوردسال بچے کے، موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان سفاکانہ قتلوں کا نتیجہ ہوا کہ شاہی خاندان میں صرف خدابندہ کے چار لڑکے باقی بچے غرض اس طرح مادرزاد اندھا خدابندہ ۱۰ سال کی ناتمام حکومت کے بعد ذیقعدہ ۹۹۵ھ میں شاہ عباس کو زمام سلطنت دے کر تخت سے دست بردار ہو گیا۔

---

[1] مؤلف تاریخ عالم آرائے عباسی

ایسی سیاسی کش مکش کے زمانہ میں عرفی نے آنکھیں کھولیں۔ بڑھا۔ پلا اور مشق سخن جاری کی۔ تعجب ہے کہ مولف شعرالعجم ایران کی سیاسی حالت کا جایزہ لینے میں ناکام رہے ورنہ ان کے قلم سے یہ الفاظ نہ نکلتے:

"عرفی نے جب[1] ہوش سنبھالا تو سلطنت صفویہ کا شباب تھا اور شاہ طہماسپ اور عباس کی علم پروری نے تمام ایران کو علم و ہنر کی نمایش گاہ بنا دیا تھا۔"

جیسا اوپر عرض کیا گیا، عرفی کی زندگی کے بیس اکیس سال واقعی ایسے دور میں گزرے جو کسی قدر پُرسکون ضرور تھا۔ لیکن شاہ عباس کے زریں عہد کی روشنی وہ اپنی آنکھوں سے کبھی نہ دیکھ سکا کیونکہ اس بادشاہ کی تخت نشینی کے تین سال قبل ہی وہاں کی غیر مطمئن حالات سے اُکتا کر وہ ہندوستان چلا آیا تھا۔ اس کے وطن شیراز پر شاہ عباس نے اپنی تخت نشینی کے تیسرے سال قبضہ کیا۔

بہر حال حالات خواہ موافق سمجھو یا ناموافق اس وقت ایران میں شعر و شاعری کا چرچا بڑے زور و دل پر تھا۔ محتشم کاشی (متوفی ۹۹۶) وحشی یزدی، غیرتی شیرازی وغیرہ نے فغانی کے طرز کو اور زیادہ شوخ کر دیا تھا اور تمام ملک ان کی زمزمہ سنجیوں سے گونج اُٹھا تھا۔ عرفی نے اپنے اظہار کمال کے لئے یہی میدان تجویز کیا تھا اور باوجود کم عمری کے پرانے اور کہنہ مشق اُستادوں سے طبع آزمائی شروع کر دی۔

اس وقت شاعری کے مرکز بہت سے تھے جن میں کاشان، یزد اور شیراز کے شعرا سے عرفی نے مباحثہ اور مکالمہ شروع کیا۔ کاشان میں مناظرہ کا عام طور پر رواج ہو چلا تھا۔ یہاں کے اساتذہ میں محتشم اور حیدر معمائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عرفات میں ہے: "محتشم۔ از اول شاہ طہماسپ تا ظہور شاہ عباس در ایران بہ اُستادی و شاعری مستقل بود۔"

غضنفر، فہمی کاشی، حاتم کاشی، باقر کاشی، سنجر کاشی، مقصود خردہ خاص طور پر مناظر تھے۔ غضنفر اور وحشی کے جھگڑے، فہمی اور وحشی کے مناظرے، حاتم اور فہمی کی چوٹیں، باقر اور حاتم و فہمی کے مباحثے "خلاصۃ الاشعار" "مآثر رحیمی" اور "عرفات العاشقین" کے صفحات کی زینت ہیں۔ شیراز کے شاعروں میں غیرتی، حسین کاشی، عارف لاہجی اور رضائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یزد کے اُستادوں میں وحشی سب سے زیادہ ممتاز تھا۔ اس کا بھائی بھی اچھا خاصہ شاعر گزرا ہے۔ وحشی نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ کاشان میں صرف کیا چنانچہ وہاں کے بیشتر شاعروں سے دو بدو مناظرے ہونے کے واقعات خلاصۃ الاشعار میں خاص طور پر مذکور ہیں۔

عرفی نے ان تینوں مرکزوں کے اساتذہ سے طبع آزمائی کی۔ شیراز کے شعرا سے تو اس نے دو در دو مقابلہ و مناظرہ کیا جب تقی اصفہانی ۹۸۹ھ میں شیراز گیا تو اس نے مشہور شعرا کے نام دریافت کئے لوگوں نے غیرتی کا پتہ دیا۔ شیراز میں ایک دکان تھی جو شعرا کا دنگل تھا۔ یہیں شیراز کے شعرا مناظرہ کرتے تھے۔ مشاعرہ میں غیرتی اور عرفی کا مباحثہ ہوا، عرفی نے دعوی کے دونوں پہلو لئے اور دونوں میں غیرتی پر غالب آیا۔ اس طرح[2] کے مناظرہ کا ذکر مآثر میں بھی پایا جاتا ہے۔

---

[1] شعرالعجم ج ۳، صفحہ ۸۳ — [2] مآثر رحیمی (بانکی پور نسخہ قلمی) ورق ۷۲

اس دور میں فغانی کی اتباع کا رواج اس درجہ ترقی پذیر تھا کہ ہر مستند شاعر اس کی غزلوں پر غزلیں لکھتا چنانچہ محتشم کاشانی اور دوسرے کاشان کے شعرا نے فغانی کے طرز پر غزلیں لکھیں اور عرفی نے بھی اسی کی غزلوں کا جواب لکھا — اس طرح سے کاشان کے شعرا سے اس نے تحریری مناظرے کئے۔ اگرچہ کسی تذکرہ سے صاف طور پر پتہ نہیں چلتا کہ اس نے محتشم سے بھی مباحثہ و مکالمہ کیا یا نہیں۔ لیکن فغانی کے طرز کی دونوں نے پیروی کی ہے اس سے شبہ ہوتا ہے شاید دونوں میں تحریری مباحثہ بھی ہوا ہو۔

وحشی اس دور کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ کاشان کے بیشتر شعرا سے اس نے مناظرے کئے۔ جھگڑے ہوئے۔ رکیک ہجویں لکھی گئیں۔ عرفی باوجود کم عمر ہونے کے وحشی ایسے کہنہ مشق شاعر کے مقابل خم ٹھونک کر آگیا۔ موخر الذکر اس وقت یزد میں تھا اور عرفی شیراز میں، اس لئے دونوں میں کئی بار تحریری مباحثے ہوئے تقی اصفہانی نے اس کی طرف صاف اشارہ کیا ہے۔ اور چونکہ اس وقت شیراز میں عرفی ہی کی صحبت میں تھا اس لئے اس کا قول نہایت ہی مستند ہے۔

عرفی، وحشی سے ۲۵ سال چھوٹا تھا۔ تقی اوحدی کے بیان کے موافق عرفی نے مناظروں اور مباحثوں کے میدان میں ۹۸۹ھ کے قریب قدم رکھا تھا اور چونکہ ۹۹۱ھ میں وحشی مر گیا تھا۔ اس لئے ان دونوں کے مناظرے تقریباً ۲ سال تک جاری رہے ہونگے۔ غرض کہ عرفی نے اپنی زندگی کی ۳۰-۳۱ منزلیں ۹۹۳ھ میں ختم کیں۔

عرفی کی اس زندگی کا کوئی مخصوص کارنامہ باقی نہیں رہا جس سے ہم اس کی شاعری کا اندازہ لگا سکیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس عمر کا بیشتر حصہ شعر و شاعری میں صرف ہوا، ایران کی زندگی ہی میں اس نے اس میدان میں کافی نام پیدا کر لیا تھا، وحشی یزدی محتشم کاشی، غیرتی شیرازی جیسے کہنہ مشق شاعروں کے سامنے ایک نوآموز اور نوجوان کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے لیکن وہ ایک استاد کی طرح ان سے زور آزمائی کرتا ہے۔ تقی اوحدی کے قول کے مطابق ۹۸۹ھ کے قبل ہی جب کہ اس کی عمر ۲۵ سال سے متجاوز نہ تھی شعرا کا ایک گروہ ہر وقت اس کی خدمت میں رہتا تھا۔ خود تقی نے جو ایک نوآموز شاعر اور ادیب و مورخ تھے اور عرفی کی صحبت سے ۴ سال تک مستفید ہوتے رہے۔ یہ سب واقعات عرفی کا کمال ثابت کرنے کے لئے لکھے ہیں۔ اس کے چھ ہزار اشعار جو ضایع ہو گئے ایران ہی کی زندگی میں کہے گئے تھے۔

ورود ہند یہ مسلم ہے کہ ایران میں عرفی کو کوئی خاص ممدوح نہ مل سکا۔ سبب ظاہر ہے۔ جب اسکی شاعری چمکی تو وہاں کی مرکزی حکومت کی باگ جس کی ترقی کا ابھی عنفوان ہی تھا ایک کمزور ہاتھ میں تھی اسی وجہ سے اہل علم کی حسب دلخواہ قدردانی نہ ہو سکی۔ یہ حقیقت حال ہے کہ طہماسپ اور عباس ایسے جلیل القدر بادشاہوں نے شعرا کی قدردانی معقول طور پر نہیں کی۔ اس کے برعکس ہندوستان میں علماء و فضلا کی قدردانی کا کچھ ایسا قدرتی سامان جمع ہو گیا تھا کہ ایران کے گوشہ گوشہ سے شعرا اور اہل علم کھنچے آتے تھے۔ اس عام سبب کے علاوہ عرفی کے آمد ہند کی کوئی اور خاص وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ عرفات کا مؤلف خاموش ہے، البتہ خلاصۃ میں ذیل کا واقعہ[1] مندرج ہے جو بظاہر بے محل و بے ربط معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] صفحہ ۱۷۶

"وسبب برآمدن او از شیراز ازیں رہگذر است کہ در سن چہاردہ و پانزدہ حسن او قبول تمام عیاری بہم رسانیدہ بود و آبلہ کشیدہ چوں سال عمرش بہ بیست رسید آبلۂ سرشتاری بر آورد، بعد از انقضائے اشتداد و انحلاص آں مرض تغیرے در چہرۂ او بہم رسید چنانچہ ہر کس کہ او را می دید از دیدنش متنفر می گردد مولوی ازیں مقدمہ بغایت آزردہ ہم بود و بہ خاطر نمی رسانید کہ

چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

از غرور جہلی کہ داشت بتابراں از وطن خروج کردہ"۔

یہ مسلم ہے کہ وہ ۹۹۴ھ میں ہندوستان آیا جب کہ اس کی عمر ۳۱ سال کی ہو چکی تھی، صاحب خلاصۃ الاشعار نے واضح طور پر یہی تاریخ لکھی ہے، عرفات کے بھی بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ تقی اوحدی نے لکھا ہے کہ اس کے ورود شیراز کے ۵ سال بعد عرفی ہندوستان کی طرف روانہ ہوا، چونکہ ۹۸۹ھ میں تقی کا شیراز جانا مسلم ہے اس لئے عرفی کا ۹۹۴ھ میں ہندوستان آنا قطعی ہے اگر میخانہ کا قول تسلیم کیا جائے تو عرفی کی وطن سے روانگی ۹۸۲ھ میں ثابت ہوتی ہے اور چونکہ ۹۸۹ھ سے ۹۹۳ھ تک اس کا شیراز کا قیام یقینی ہے اس لئے میخانہ کی روایت پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچ سکتی۔ مزید براں جو وجوہ اس نے بیان کئے ہیں وہ بھی قابل قبول نہیں معلوم ہوتے، اول الذکر لوگوں کا تنفر بیان کیا ہے[1]، بچند غرور جہلی وجہ تحریک قرار دی ہے۔

شعر العجم میں لکھا ہے کہ بعض تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ شاہزادہ سلیم کے حسن پر "غائبانہ عاشق" ہو گیا تھا۔ یہ جملہ الف لیلہ اور چہار درویش کے قصہ کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ تعجب ہے کہ مولانا شبلی جیسے محقق نے اس بات کو کیونکر قبول کر لیا۔ میں نے ابتک جتنے تذکرے دیکھے ہیں ان میں سے کسی میں اس کے وطن چھوڑنے کی یہ وجہ نظر نہ آئی۔ جن تذکروں میں شاہزادہ سلیم سے خاص ارتباط رکھنے کا بھی ذکر ہے ان میں بھی اس کے غائبانہ عشق کو وطن سے نکلنے کی وجہ قرار نہیں دی گئی ہے، حقیقت ہے کہ مولانا کا اشارہ تمہید ہے ایک بہت بڑے واقعہ کی جس کا بیان آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

قیام احمد نگر تا ۹۹۵ ہجری

عرفی کس راستے سے ہندوستان میں داخل ہوا اس کے ذکر سے اکثر تذکرے خالی ہیں۔ معاصر تذکرہ نگار مثلاً عبدالباقی عبدالنبی، تقی اوحدی نے بھی کچھ نہیں لکھا۔ شعر العجم[2] بھی اس بارہ میں صرف اتنا لکھتا ہے کہ اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ راستہ میں ڈاکہ پڑا اور اس کی کل کائنات جاتی رہی۔ اس پر یہ رباعی کہی:

دوشینہ کہ بُرد برد بر دوشم بود — زانو چو عروس نو در آغوشم بود
پوشیدنیٔ نہ داشتم غیر از جسم — چیزے کہ بزیر سر نہم گوشم بود

لیکن دوسرے معاصر اور مشہور تذکرہ نویس یعنی تقی کاشی نے لکھا ہے کہ وہ براہ دریا ہندوستان آیا، ایک تیسرے معاصر امین احمد رازی کے بیان سے بھی اسی قول کی تائید ہوتی ہے، غلام علی آزاد نے ید بیضا اور سرو آزاد دونوں میں لکھا ہے کہ عرفی دریا کے راستہ ہندوستان میں داخل ہوا، ہمیشہ بہار اور تحفۃ الکرام کے بیانات بھی اسی امر کے موید ہیں۔ فہرست بانکی پور

---

[1] خ ۳ صفحہ ۸۴ — [2] خ ۳ صفحہ ۸۴

میں بھی دکن کے قیام کا ذکر ہے۔ محبوب الزمن میں جو صرف شعرائے دکن کا تذکرہ ہے عرفی کا شمول اس قیاس کی تائید کرتا ہے کہ وہ دکن میں مقیم رہ چکا ہے۔ البتہ نشر عشق میں شمالی ہندوستان سے دکن جانے کا ذکر ہے جو پایۂ تحقیق تک نہیں پہونچتا مزید براں شیراز سے ہندوستان آنے کا راستہ یہی تھا۔ دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں بحری سفر بہت آسان متصور ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ہزارہا اہل علوم مثلاً مولانا نظیری، ظہوری، ملک وغیرہ اسی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے اس لئے اگر عرفی نے بھی یہی راستہ اختیار کیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

تحفۃ الکرام، یدِ بیضا، سرو آزاد اور ہفت اقلیم میں لکھا ہے کہ عرفی بندر جرون[1] ہو کر آیا ہے، اس بندر کو اس زمانہ میں خاص اہمیت حاصل تھی۔

ہندوستان میں آکر وہ سیدھا احمد نگر آیا۔ تقی کاشی، اور امین احمد کے علاوہ ہمیشہ بہار[2] نے صراحتاً لکھا ہے کہ:۔

"ہنگامے کہ عزم سواد ہندوستان نمود اول بہ دکن آمد و چندے در احمد نگر با مولانا ملک قمی و مولانا ظہوری صحبت داشت و باز متصل اکبر آباد در فتحپور سیکری رسید"۔

تقی اور امین احمد نے ملک اور ظہوری سے ملاقات نہیں لکھی اور بقیہ تذکروں میں صرف دکن کا ورود لکھا ہے۔ احمد نگر کا نام نہیں لکھا، لیکن چونکہ احمد نگر دکن ہی میں ہے اس لئے ان دو قسم کے بیانوں میں تضاد نہیں ہے۔

بہرحال چونکہ اس دور میں ظہوری اور ملک کا قیام ان دنوں احمد نگر ہی میں تھا۔ اس لئے عرفی اور ان لوگوں کی ملاقات تقریباً یقینی ہے۔ عرفی اور ظہوری کے درمیان خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ ظہوری کا عرفی کے پاس شال کا ہدیہ بھیجنا اور آخر الذکر کا ایک طنز آمیز خط لکھنا اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ دونوں کی ملاقات احمد نگر میں ہو چکی ہے۔

تمام تذکرے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اس بات پر متفق ہیں کہ احمد نگر یا دکن میں اس کی قدر دانی حسب دلخواہ نہیں ہوئی اور ہوتی تو کیوں کر ہوتی۔ وہاں کا بھی حال ویسا ہی تھا جیسا عرفی نے اپنے وطن میں دیکھا تھا۔ یہ دور مرتضیٰ نظام شاہ (۹۷۲ - ۹۶) کی حکومت کا تھا۔ آخر عمر میں وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے سارے انتظام میں خلل پڑ گیا تھا۔ قتل عام کا بازار گرم تھا۔ نظام شاہی سلطنت کی بنیاد متزلزل ہو رہی تھی ۹۹۶ اور ۹۹۸ کے درمیان دو مرتبہ ایسا زبردست قتل عام ہوا کہ جتنے پردیسی تھے ان میں سے بیشتر موت کے گھاٹ اُتار دئے گئے۔ افواہ اُڑی کہ ظہوری اور ملک بھی اسی ہنگامہ کی نذر ہو گئے۔ (بدایونی)

ایسے حالات میں شعرا کی قدر دانی ناممکن تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عرفی کسی دکنی دربار سے متوسل نہ ہو سکا اور غالباً ایک سال کے اندر ہی وہ وہاں سے شمالی ہندوستان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

عرفی کی زندگی میں دکن کا قیام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ نہ بادشاہ سے اس کا تعلق ہو سکا اور نہ اہل دول سے۔ اسکا ثبوت

---

[1] ج ۳ ص ۸۴ — [2] جرون (ہرمز نو) جزیرہ است۔ در دریا قریب بہ ساحل فارس (میخانہ صفحہ ۴۵۸) مآثر رحیمی ج ۳ میں اس کا نام "جروں" لکھا ہے دیکھو صفحہ ۹۲۶، ۱۴۷۳، ۱۵۶۶ — [3] نسخہ بانکی پور ورق ۵۸

ہے کہ اس کے موجودہ کلیات میں کوئی نظم یا قصیدہ کسی دکنی امیر یا سلطان کے نام کا نہیں ہے۔

عالی ہند کا قیام تا ۹۹۹ ہجری

۹۹۴ کے آخر یا ۹۹۵ ہجری کی ابتدا میں عرفی نے شمالی ہندوستان کی طرف رخ کیا، اور یہاں اگرچہ سیکڑوں امیر اور قدر دان تھے لیکن ان سب میں اس نے فیضی کو منتخب کیا جسکی بقول شبلی یا تو یہ تھی کہ اس کے دربار کی رسائی آسان تھی یا یہ کہ سخن شناسی کی جو توقع فیضی سے ہو سکتی تھی اور کسی سے نہیں ہو سکتی تھی۔

عرفی، فتحپور سیکری میں فیضی سے ملا۔ فیضی نے اس کی بڑی عزت کی اسی درمیان میں فیضی نے پنجاب اور سرحد کا سفر کیا۔ سفر ۹۹۴ میں جب یوسف زئی پٹھانوں پر اکبر نے فوجیں بھیجیں تو فیضی بھی اس مہم پر مامور کیا گیا تھا۔ غالباً اس کا سفر اکبر کے ہمرکاب ہوگا جس نے ۹۹۴ ہجری میں کشمیر کی فتوحات کے سلسلہ اٹک میں قیام کیا تھا۔ بدایونی نے لکھا ہے کہ اس سفر میں عرفی، اٹک تک اسی کے ہم رکاب رہا اور اس کی تمام ضروریات فیضی ہی کی سرکار سے پوری ہوتی رہیں۔

لیکن فیضی اور عرفی کی دوستی ایک سال سے زیادہ نہ قایم رہ سکی۔ کیونکہ تمام تذکرے متفق ہیں کہ فیضی کے دامن دولت سے انقطاع کے بعد عرفی نے حکیم ابوالفتح گیلانی سے روابط پیدا کئے اور اس کی صحبت سے اس نے کافی استفادہ کیا۔ اور چونکہ حکیم مذکور کا انتقال ۹۹۷ھ میں ہوا اس لئے اس سے قبل فیضی سے قطع تعلق ضرور ہو گیا ہوگا۔

فیضی سے تعلق منقطع ہو جانے کی وجہ بقول شبلی، عرفی کی نخوت پرستی ہے۔ لیکن بظاہر صرف یہی سبب نہ رہا ہوگا عرفی دربار ہی سے متعلق ہونا چاہتا ہوگا، لیکن ابوالفضل اور فیضی کے آگے اس کا چراغ نہیں جل سکتا تھا اور اس کا کامیاب نہ ہونے دینے کا سبب یہ ہوگا کہ اس کی جودت طبع، سرعتِ فکر اور وقت نظر کی وجہ سے دونوں کو اس کا خطرہ محسوس ہوا ہوگا کہ اگر اس کو دربار میں باریابی حاصل ہو گئی تو پھر ان کی شہرت کا چراغ گل ہو جائے گا۔ مگر بدایونی نے قطع تعلق کی وجہ ذیل کی طنز آمیز گفتگو قرار دی ہے جو شعر العجم میں بھی منقول ہے:-

"روزے[1] بہ خانۂ شیخ فیضی آمد چوں سگ بچہ را با شیخ مخلوط دید برسید کہ ایں مخدوم زادہ را چہ نام است با شیخ گفت 'عرفی'، او در بدیہ گفت "مبارک باشد" (مبارک فیض کے والد کا نام تھا)

یہ واقعہ اکثر تذکروں میں مذکور ہے لیکن خافی خاں نے اس کو ۱۰۰۱ھ کا قرار دیا ہے۔ اگر یہ تاریخ صحیح ہے تو یہ واقعہ بالکل غلط ثابت ہوگا اس لئے کہ عرفی اس کے دو سال قبل ہی فوت ہو چکا تھا۔

ایک دوسرا واقعہ صرف شعر العجم میں [illegible] خاں کے حوالے سے منقول ہے "ایک دفعہ (عرفی) ابوالفضل سے ملنے گیا دیکھا تو ابوالفضل دوات میں دابے ہوئے سونچ میں بیٹھا ہے، سبب پوچھا۔ ابوالفضل نے کہا بھائی صاحب کی تفسیر بے نقط کا دیباچہ اسی صنعت میں لکھ رہا ہوں۔ ایک موقع پر والد کا نام آگیا ہے چاہتا ہوں کہ نام بھی آئے اور صنعت کا التزام بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ عرفی نے کہا اس کی کیا بات ہے اپنے لہجہ میں مبارک لکھ دیجئے"۔

---

[1] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۲۸۵

یہ واقعہ بھی ۱۰۰۱ھ کا بتایا گیا ہے، اگر یہی تاریخ صحیح مان لی جائے پھر بھی اس واقعہ کے سرتاپا غلط ہونے میں کسی کا شبہ نہیں رہ جاتا کیونکہ عرفی کا انتقال دو سال قبل ہی ہو چکا تھا لیکن اس واقعہ کو ۱۰۰۱ھ کے بہت بعد کا سمجھنا چاہئے کیونکہ "سواطع الالہام" (فیضی کی تفسیر بے نقط) ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ میں تکمیل کو پہونچی اور اس کا دیباچہ اس سنہ کے بعد لکھا گیا ہوگا بلکہ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ابوالفضل نے فیضی کے انتقال کے بعد اس کام کو پورا کرنا چاہا ہوگا اور چونکہ فیضی کا انتقال صفر ۱۰۰۴ھ میں ہو چکا تھا اس لئے اس واقعہ کو اس کے بعد کا سمجھنا زیادہ قرین صحت ہے۔ حالانکہ اس کے پانچ سال قبل ہی عرفی سفر آخرت اختیار کر چکا تھا۔ شعر العجم جیسی معتبر تاریخ میں ایسے لایعنی واقعات کا جگہ پا جانا حیرت انگیز ہے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ مخزن الغرائب اور نشتر عشق میں موجود ہے، ابوالفضل اور فیضی نے عرفی کو اکبر کے سامنے ذلیل کرنے کی کوشش کی لیکن آخر میں خود ذلیل ہوئے، مخزن نے یہ واقعہ نقل کر کے خود اس کی تردید کی ہے۔

ابوالفتح گیلانی سے تعلقات تا ۹۹۷ھ ہجری

حکیم ابوالفتح اگرچہ منصب کے لحاظ سے امرائے دربار اکبری میں سب سے کم پایہ کا تھا لیکن بڑا زبردست عالم اور علم و فضل کا بڑا قدردان تھا۔ اسی وجہ سے عرفی نے اس سے تعلقات پیدا کئے۔ اول اس نے ایک قصیدۂ رحیہ لکھ کر پیش کیا۔ غالباً یہ سب سے پہلا قصیدہ تھا جو کسی کی مدح میں لکھا گیا۔ اس سے عرفی کی آن ٹوٹی، اس کا اسے بے حد صدمہ ہوا، چنانچہ قصیدہ میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں:

۱- خیال بندگیت دوش نقش می بستم — زروے کسب شرف نے زروے استعداد

۲- بہ خدمت آمدم اینک بگوچہ مصلحت است — بر آستان تو باید نشست یا استاد

عرفی نے اس کے فیض صحبت سے بڑی ترقی کی، اس کا اشارہ حکیم صاحب نے ایک رقعہ میں جو خان خاناں کے نام ہے کیا ہے، میخانہ میں بھی لکھا ہے[1]:- "از فیض تربیت آں صاحب عیار دانش از حضیض پستی بہ مقام اوج بلندی رسید"

عرفی نے حکیم مذکور کی احسان مندی کا پورا حق ادا کر دیا۔ جس زور کے قصیدے حکیم صاحب کی شان میں لکھے اکبر و خان خاناں کی مدح میں نہ لکھے۔ افسوس یہ ہے کہ عرفی حکیم ابوالفتح کے دامن دولت سے ایک سال سے زیادہ وابستہ نہ رہ سکا کیونکہ حکیم کا انتقال ۹۹۷ھ میں ہو گیا[2]، عرفی پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا چنانچہ اس وقت جو قصیدہ خان خانخاں کی مدح میں لکھا اس میں کہتا ہے:-

---

[1] میخانہ: صفحہ ۱۷۶ — [2] ۹۹۴ھ میں حکیم ابوالفتح سرہ ری پٹھانوں کی مہم پر بھیجے گئے تھے۔ فیضی بھی ان دنوں اسی طرف تھا۔ عرفی، فیضی کے ہمراہ اٹک تک جہاں شہنشاہ اکبر مقیم تھے، گیا تھا کشمیر کی مہم بھی انھیں ایام میں شروع ہوئی تھی، جب اس پر قبضہ ہو گیا۔ تو ۹۹۷ھ میں شہنشاہ اکبر اسکی سیر کو گئے، ان کے ہمراہ ابوالفتح اور فیضی وغیرہ تھے۔ عرفی بھی حکیم مذکور کی معیت میں وہاں گیا۔ وہاں سے واپسی میں حکیم دردِ شکم میں مبتلا ہو گئے۔ حسن ابدال میں قیام ہوا، ان کا مرض بڑھتا گیا۔ بادشاہ دو دفعہ عیادت کو گئے۔ آخر کو وہیں انتقال ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ انھیں دنوں میں علامہ فتح اللہ شیرازی جو کشمیر کی سیر میں اکبر کے ہم رکاب تھے، راہی ملک بقا ہوئے اور حسن ابدال ہی میں مدفون ہوئے، حزنی سادھجی نے تاریخ وفات نظم کی ؎

امروز دو علامہ زعالم رفتند — رفتند و موخر و مقدم رفتند،

چوں ہر دو موافقت نمودند بہم — تاریخ رشید کہ ہر دو باہم رفتند

عرفی نے یہ سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لئے اسکے دل پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا، جیسا کہ عرفی کے اس سوگ کے قصیدہ سے صاف ظاہر ہے۔ اس تفصیل سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عرفی کی شمالی ہند کی زندگی کا بیشتر حصہ، کشمیر، پنجاب اور سندھ کی سیر و سیاحت میں گزرا اور آگرہ کا قیام محض ضمنی تھا۔ ممکن ہے کہ وہاں سے جب ۹۹۵ھ کے قریب گیا تو پھر واپس نہ آیا ہو۔ (آثار صنادید، سرسید احمد خاں، دربار اکبری)

چہ احتیاج کہ گویم کہ مُردۂ عرفی را، چہ بر سر از ہوس مرگ ناگہاں آمد
دریں مصیبت عظمیٰ کہ دہر سنگیں دل زگریہ ہر سر مو چشم خوں فشاں آمد
برفت و لطفِ تو بر من گزاشت وایں بدل است بہ نزدِ عقل کہ تاوان آں زیاں آمد
تو آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید چہ گنج ہائے سعادت زیانِ جاں آمد

حکیم ابو الفتح اور خانِ خاناں سے بہت اتحاد تھا چنانچہ حکیم مذکور کی فرمائش سے اس نے ایک زوردار قصیدہ لکھا اور بقول صاحب میخانہ دکن بھیجا جس کے عوض میں خان خاناں نے لاکھ صلہ بھیجا۔ لیکن میخانہ کا قیاس صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ۹۹۲ھ کے قریب یہ قصیدہ لکھا گیا ہو اور ان ایام میں خان خاناں کشمیر و سندھ کی فتوحات میں مشغول تھا۔ اس قصیدہ میں دونوں کی محبت و ارتباط کا ذکر نہایت لطیف پیرایہ میں ہوا ہے:۔

ازاں نہ دیدہ ثنا گویمت کہ می بینم ترا و اورا یک تن بہ پیشم و دو جانی
دلیل وحدتم ایں بس کہ مدح خود می خواہد مرا بہ مدح تو فرمود گوہر افشانی

دیکھئے ایک سال کی مداحی میں کس قدر گوہر بے بہا اکٹھا کئے ہیں، معلوم ہوتا ہے ایسے شخص کا مذکور ہے جس سے برسوں کی محبت ہے اور جس نے عرفی کی زندگی کا تجزیہ نہیں کیا ہے وہ اس بات کو علی وجہ قبول نہیں کر سکتا کہ عرفی، حکیم مذکور سے کم و بیش ایک ہی سال وابستہ رہ سکا۔

خان خاناں اور عرفی تا ۹۹۹ھ حکیم ابو الفتح کے فوت ہو جانے پر عرفی نے خان خاناں کے ساتھ وابستگی پیدا کی۔ اگرچہ پہلے ذکر ہو چکا ہے خود حکیم مذکور کی زندگی ہی میں خان خاناں کی مدح میں اس نے قصیدہ لکھ بھیجا تھا لیکن اسوقت اس سے وابستہ نہیں ہوا تھا کیونکہ حکیم ہی اس کا مربی اور آقا تھا۔ بہرحال جو قصیدہ اس موقعہ پر لکھا ہے اس کا مطلع یہ ہے:

ز آسمان و زمین مژدہ ناگہاں آمد کہ آفتاب زمین تاج آسمان آمد

خان خاناں کے دربار میں پہونچ کر عرفی نے خاطر خواہ ترقی کی، مآثر رحیمی میں ہے[1]۔

"بہ اندک فرصتے بہ یمن تربیت و شاگردی و مداحی ایں دودمان رتبہ پختگی کلام و ترقی مالا کلام و منظور ناتش بہم رساند"

خان مذکور کے متوسلین میں نظیری، شکیبی، انیسی وغیرہ تھے۔ ان سے برابر مقابلہ رہتا تھا، اس لئے عرفی کا کلام روز بروز ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ تقرب و اختصاص میں وہ سب سے ممتاز ہوا، یہ بات اسی کو نصیب ہوئی کہ دربار میں جس جگہ چاہتا اور جس طرح چاہتا بیٹھ جاتا چنانچہ مآثر رحیمی میں ہے[2]:۔

"الحق ایں شاعر را ایں رتبہ و حالت در ملازمت بادشاہان زماں و اکابر دوراں ہم نہ رسیدہ بود، چناں کہ در ایام ملازمت تسلیمہ بکورنشے کہ در مجالس تعارف ست کہ بہ عوض سلام بہ صاحبان می کنند بہ صاحب خود نمی کرد و ہر طور کہ می خواست در مجالس حق نشستہ و اہل عالم تقدیم او را قبول نمودہ اند"

عرفی خان خاناں کے ساتھ سفر و حضر میں رہا چنانچہ ۹۹۹ھ میں جب خان خاناں نے مرزا دانیال بیگ تہمتن ملک دکھن پر حملہ کیا تو عرفی اس کے ساتھ رہا اور غالباً اسی سفر سے واپسی میں اسی سال شوال کے مہینہ میں لاہور میں انتقال کیا۔

---

[1] و [2] دیکھو ورق ۷۲ ب

خان خاناں نے عرفی کے ساتھ جو فیاضیاں کیں اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک قصیدہ پر ستر ہزار روپے انعام دلوائے۔

عرفی اور اکبر عرفی نے خان خاناں اور ابو الفتح کے سوا کسی امیر کی مدح سرائی گوارا نہ کی، کیونکہ مدح سرائی سے اسے طبعاً نفرت تھی جیسا کہ خود کہتا ہے :۔

قصیدہ نظم ہوس پیشگاں بود عرفی — تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل است

لیکن فرمانروائے وقت سے یہ بے نیازی ممکن نہ تھی۔ اس لئے خود اپنی خواہش سے یا خان خاناں اور ابو الفتح کی فرمائش سے اکبر کی مدح میں اس نے متعدد قصاید لکھے۔ معلوم نہیں کہ اس کو شاہی دربار کی باریابی حاصل ہوئی یا نہیں کیونکہ تمام تذکرہ اس بارہ میں خاموش ہیں صرف براؤن نے لکھا ہے کہ اس کی رسائی ہوئی تھی، چنانچہ بادشاہ کے ہمراہ ۹۹۷ھ میں کشمیر گیا تھا اور کسی موقع پر بادشاہ نے ایک گھوڑا انعام میں دیا تھا لیکن عرفی نے بجائے اظہار تشکر کے اُلٹے گھوڑے کی ہجو کی۔

شاہنشہا حقیقت اسپے کہ دادۂ — بشنو ز لطف تو بہ سانم بعنبر عرض

ہستم برا و سوار و بہ معنی پیادہ ام — گامے بطول می زدم اکنوں زنم بعرض

کشمیر کے سفر میں فیضی بھی بادشاہ کے ہم رکاب تھا۔ ممکن ہے کہ پرانے تعلقات کی بنا پر فیضی کی معیت میں عرفی، کشمیر کی سیر کو چلا گیا ہو۔

عرفی اور شاہزادہ سلیم خان خاناں اور اکبر کے علاوہ عرفی نے کسی اور آستانہ کی "ناصیہ سائی" کی تو وہ شاہزادہ سلیم ہے، یہ معلوم نہیں کہ عرفی نے شاہزادہ سے رابطہ کب پیدا کیا — نہ تذکروں میں اس کے بارہ میں کچھ لکھا ہے اور نہ قصیدوں سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بہر حال شمالی ہندوستان میں آکر اس نے شہزادے سے ارتباط پیدا کیا ہوگا۔ عرفی کی تاریخ زندگی میں اس واقعہ کو جتنی اہمیت حاصل تھی اس سے زیادہ اہم بنا کر پیش کیا گیا ہے، مولانا شبلی نے اس میں بہت کافی حصہ لیا ہے، چنانچہ شعر العجم میں بار بار عرفی کو شہزادہ سلیم کا عاشق قرار دیا گیا ہے۔ مجھے مولانا سے اختلاف ہے اس لئے میں ان کے اقوال کو ہر حیثیت سے جانچنے کی کوشش کروں گا۔

اس سے قبل مولانا کا وہ قول لکھا جا چکا ہے جس میں انھوں نے عرفی کا غائبانہ عشق بیان کیا ہے۔ اگر اس میں کسی قسم کی حقیقت ہوتی تو عرفی کسی دربار یا کسی امیر سے تعلقات کیوں پیدا کرتا۔ سیدھا ہندوستان آتا اور شاہزادہ سے متعلق ہو گیا ہوتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ احمد نگر آیا۔ وہاں قدر دانی نہ ہو سکی تو شمالی ہندوستان آیا اور فیضی سے تعلقات پیدا کئے۔ پھر جب اس سے نہ نبھ سکی تو حکیم ابو الفتح نے اس کو نوازا اور آخر میں خان خاناں نے اس پر احسانات کئے۔ درمیان میں کبھی کبھی اس نے بادشاہ وقت اور شہزادہ دونوں کی مدح سرائی بھی کر دی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان دونوں سے تعلقات کی نوعیت محض ضمنی اور ثانوی تھی — دوسری جگہ مولانا رقم طراز ہیں :۔

"عرفی ایک طرف نکتہ سنج، نکتہ شناس اور ذوق عرفان سے آشنا تھا، دوسری طرف شباب میں نہایت خوش رو اور حسین اور لوگوں کا منظور نظر، رہ چکا تھا۔ ہندوستان میں آیا تو شاہزادہ جہانگیر پر عاشق ہوا۔ ان اسباب کی بنا پر وہ عشق و محبت کی ایک ایک ادا سے واقف تھا"

سلہ شعر العجم ج ۳ ص ۱۱۱

مولانا کا یہ قول محض طبع زاد اور خود ساختہ ہے۔ کسی تذکرہ میں نہ اس کے حُسن و خوش روئی کا بیان ہے اور نہ اسکے "منظورِ نظر" رہنے کا۔ شعر العجم میں جن جن تذکروں کا ذکر آیا ہے وہ سب میرے پیش نظر ہیں۔ ان میں سے کسی میں یہ واقعہ مذکور نہیں، اس غیر ذمہ دارانہ بات کی بظاہر دو وجہیں ہو سکتی ہیں (۱) مولانا کو اس کے شباب کی کوئی تصویر ہاتھ لگ گئی ہو اور اس کو دیکھ کر انھوں نے دو نتیجے نکالے یعنی وہ دوسروں کا "منظورِ نظر" رہ چکا تھا اور پھر خود جہانگیر کا عاشق ہوا۔ (۲) انھوں نے عرفی کے کلام کا مطالعہ کیا تو وہ عشق و محبت کی ایک ایک ادا سے واقف نکلا اس پر مولانا نے مذکورۂ بالا حکم لگا دیا ۔ ایک اور مقام پر مذکور ہے[۱۵]:۔

"تمام تذکرے متفق ہیں کہ عرفی شاہزادہ مذکور کا جاں دادہ ہے، یہ امر اگرچہ بظاہر خلاف قیاس ہے لیکن عرفی کے قصاید میں بلاشبہ یہ جھلک پائی جاتی ہے۔ شاہزادہ موصوف کی شان میں اس کے جو قصیدے ہیں ان کے دیکھنے سے صاف نظر آتا ہے کہ یہ اور کوئی جوش ہے جس کا رنگ مداحی کے لباس میں جھلک رہا ہے"

اگر اوپر کے بیان میں "تمام" کے بجائے "کچھ" ہوتا تو یہ بیان کسی قدر درخور اعتنا ہوتا۔ کیونکہ تمام تذکروں میں عرفی کی فریفتگی کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ معاصر تذکرہ نویس سب کے سب خاموش ہیں، نہ مآثر رحیمی میں یہ واقعہ مذکور ہے، نہ عرفات العاشقین میں، نہ میخانہ میں اس کی طرف اشارہ ہے نہ بدایونی میں، نہ خلاصۃ الاشعار میں یہ بات درج ہے اور نہ ہفت اقلیم میں، یہ چھ تذکرے عرفی کی تاریخ زندگی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں ۔ متاخرین میں والہ داغستانی پہلا تذکرہ نویس ہے جس کا بیان قابل توجہ ہے:۔

"او با شاہزادہ سلیم، خصوصیت و محبت مفرط داشتہ چنانچہ بعضے بہ عشق شاہزادہ متہمش کردہ اند"

اس بیان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ خود مؤلف کو اس واقعہ سے انکار ہے جو لوگ اس کو شاہزادہ کا عاشق سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ یہ محض تہمت و الزام بیجا ہے۔ بات یہ ہے کہ شاہزادہ سے اس کو بے حد محبت و خصوصیت تھی اور محبت و خصوصیت عشق مذموم ہی کا لازمی نتیجہ نہیں ہوا کرتا۔

بتلا بھی کچھ اسی طرح کا راگ الاپتا ہے لیکن اس کا بیان بہت واضح نہیں ہے:۔

"باشاہزادہ سلیم خصوصیت و محبت مفرط داشتہ"

اول تو یہ "جملہ والہ" کے بیان سے ماخوذ ہے، دوم اس میں عشق و عاشقی کا مطلق ذکر نہیں ہے اور نہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ شاہزادہ کا عاشق تھا اور نہ یہ کہ یہ الزام محض ہے۔

مؤلف مراۃ آفتاب نما لکھتا ہے:۔ "حسادش بہ عشق شاہزادہ متہم کردہ" ۔۔۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاہزادہ سے عشق محض الزام تھا جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

جو تذکرے میرے پیش نظر ہیں، ان میں صرف تین متذکرہ بالا تذکرے ایسے ہیں جن میں شاہزادہ سے خصوصیت و محبت کا بیان ہے، یہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا کہ ان میں سے کسی کے بیان سے یہ ہرگز مترشح نہیں ہوتا کہ عرفی کو شاہزادہ سے عشق تھا۔ اس نے تو صاف صاف اور ایک نے دبی آواز میں اس بات سے قطعی انکار کیا ہے۔ پھر اب وہ کون سی تمام کتابیں یا تمام تذکرے ہیں جنکی

بنا پر مولانا شبلی جیسے مورخ و محقق نے "عرفی" کو مورد الزام ٹھہرایا۔

اب ذرا ایک قصیدے کے چند اشعار کو جانچ لیجئے جن کو مولانا شبلی صرف جھوٹے عشق اور ہوس ناکی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں[1]:۔ "عرفی کو اس خوش قسمتی پر ناز ہو سکتا ہے کہ شہزادہ نے خود اس کو یاد کیا اور دربار میں بلا کر قصیدہ لکھنے کی فرمایش کی عرفی جس شان سے دربار پہونچا ہے اور شاہزادہ نے جس طرح نگاہ پنہاں سے باتیں کی ہیں اس کی تصویر خود عرفی نے نہایت خوبی سے کھینچی ہے:۔

که ناگهاں زدرم در رسید مژده وهے — چناں که از چمن طالعم به مغز بشمیم
چه گفت گفت که اے مخزن جواهر قدس — چه گفت گفت که اے مطلب بهشت نعیم
بیاکه از گهرت یاد می کند دریا — بیاکه تشنه لبت را طلب کند تسنیم
به ره فتادم و گشتم چناں شتاب زده — که دست اہل کرم در نثار گوهر و سیم
مرا چو دوش بروش ادب بدید استاد — به لطف خاص بدل کرد التفات عمیم
رموز کوشش و تسلیم را ادا کردم — بداب مردم دانا نه بذله سنج ندیم
نگفت و من بشنودم همانچه گفتن داشت — که در بیان نگهش کرد بر زباں تقدیم
لبش چو نوبت خویش از نگاه باز گرفت — فتاد سامعه در موج کوثر و تسنیم

دوسری جگہ پھر رقمطراز ہیں[2]:۔ "چونکہ عرفی جہانگیر کا عاشق تھا ہمہ تن شوق اور بے تابی کے عالم میں گیا، جہانگیر نے نگاہ لطف سے دیکھا اور اشاروں میں باتیں کیں پھر قصیدہ لکھنے کی فرمایش کی"۔

میری رائے ناقص میں مذکورہ بالا اشعار میں کوئی شعر عشق و عاشقی سے دور کا بھی لگاؤ نہیں رکھتا۔ البتہ یہ بہترین قسم کی شاعری اور ایک نفیس واقعہ کی زندہ تصویر ہے، ان کے مطالعہ سے حالات کا بعینہ سماں نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے شعر پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ شاعر نہایت کامیابی سے اپنی تعریف کرنے میں عہدہ برآ ہوا ہے۔ اپنے کو "مخزنِ جواہر قدس" اور "مطلب بہشت نعیم" قاصد کی زبان سے کہلوانا ہے۔ پھر اسی کی زبان سے اپنے کو "گہر" اور سلیم کو "دریا" قرار دیتا ہے۔ چوتھے شعر میں "تیز رفتاری" کو اہل کرم کے "دست سخا" سے مقابلہ کرنا کس قدر عمدہ اور برمحل ہے۔ "التفات عمیم" کا "لطفِ خاص" میں بدل دینے کی وجہ بھی ظاہر کرتا ہے۔ نگاہ کا زبان پر پیش دستی کرنا بالکل فطری ہے۔ اس کا بیان جس انداز سے کیا ہے اسکی نظیر مشکل سے ملے گی۔ پھر ہونٹوں کے بیان سے محظوظ ہونے کی حالت کو کامیابی کے ساتھ نظم کرنا معجز نگاری کی دلیل ہے۔

دوسری چیز جو مولانا شبلی نے عرفی کا عشق مذموم ثابت کرنے کے لئے پیش کی ہے وہ عرفی کا ایک قطعہ ہے۔ یہ قطعہ سعدی کے ایک قطعہ کا جواب ہے جس میں یہ مضمون بندھا تھا کہ اس شاعر کو عاشقی کا نام نہ لینا چاہئے جو قصیدہ میں دو چار شعر عشقیہ کہکر مداحی شروع کر دیتا ہے، عرفی کے قطعہ کا مفہوم خود مولانا کی زبان قلم سے یوں ادا ہوا ہے:۔

---

[1] شعر العجم ج ۳، صفحہ ۸۹۔ [2] شعر العجم ج ۳، صفحہ ۱۰۹

"سعدی گو ممدوح کو معشوق پر ترجیح نہیں دیتے لیکن بہرحال معشوق کے علاوہ ان کا کوئی اور ممدوح بھی ہے،
لیکن میرا تو ممدوح بھی وہی ہے جو معشوق ہے"

اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ جب یہ قطعہ شاہزادہ سلیم سے متعلق نہیں ہے تو پھر اس میں جو لطیف اشارہ ہے اس کو شاہزادہ مذکور کی معشوق کی طرف کیوں سمجھا جائے۔ دوم یہ کہ شاعر اپنے ممدوح کے لئے معشوق کا لفظ عموماً استعمال کیا کرتے تھے۔ فارسی شاعری میں اس کا عام طور پر رواج ہو چکا تھا۔ مثلاً اسی دور کے ایک دوسرے ممتاز شاعر ظہوری نے اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ - ۱۰۳۷) کے لئے صدہا شعروں میں نہ صرف "معشوق" اور "محبوب" جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں بلکہ اس کی چشم، خمار آلود، کاکل، چال وغیرہ کی تعریف مختلف انداز اور عنوان سے کی ہے۔ باوجود اس کے یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہوس باز عاشق تھا۔

فارسی زبان کے ماہر اور ادیب کا بغیر کسی خارجی روایت کے کسی شاعر کے کلام کو اس کے ذاتی عشق و ہوالہوسی کا لازمی نتیجہ سمجھنا حیرت انگیز ہے، عرفی کی بد دماغی اور ناقابل برداشت غرور کی بہتوں نے شکایت کی ہے، اور اسی وجہ سے دربار اکبری میں اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود فیضی جو اس کا سب سے بڑا حریف تھا اس کی شریف النفسی کی تعریف اس طرح کرتا ہے:۔ "واز تہذیب اخلاق چہ گوئید کہ در فطاکی نہاد شیراز ذاتی می باشد نہ کسبی"

اگر وہ رند و اوباش ہوتا تو اول اس کی رسائی دربار اکبری میں نہ ہوتی، اگر ہوتی بھی تو اس کی فضیحت بری طرح ہو جاتی۔ دوم یہ کہ زبردست حریف جن کی تعداد کم نہ تھی یقیناً اس کی گندگی کو اچھالتے، لیکن معاصرین کی خاموشی جن سے اس کی چشمک بھی تھی، بلکہ بعض کی ستائش اس بات کی بین دلیل ہے کہ وہ خصایل رذیلہ سے پاک تھا۔ چنانچہ خود مولانا شبلی نے اقرار کیا ہے کہ خلاف اور شعراء کے وہ رند و اوباش نہ تھا۔ ایک بار کسی نے اس پر فسق کا الزام لگایا تھا جس کا اس کو بے حد صدمہ ہوا، چنانچہ کہتا ہے:۔

اہل دنیا ہمگی تہمت گیرند و فساد عیسیٰ ایں را متحمل شدہ مریم برداشت

ایسے بلند اخلاق انسان اور بے بدل شاعر کو بغیر کسی سند کے ایک سنگین الزام کا مورد ٹھہرانا بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔

قیام ہند پر اجمالی نظر

تفصیل بالا سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عرفی کی مختصر زندگی کا زیادہ حصہ ایران ہی میں گزرا عمر کا کچھ حصہ کسب علوم میں اور کچھ شاعروں کے دنگل میں بسر ہوا، وہیں وہ بڑھا۔ پلا۔ پروان چڑھا۔ وہیں اس کی شاعری چمکی اور اس کی روشنی دور و نزدیک پہونچی، وہیں اس نے غیرتی، محتشم، وحشی جیسے شعراء سے مقابلہ کیا، لیکن اسکے کلام کا بیشتر حصہ جو اس کی شہرت کی اصل وجہ ہے، ہندوستان کی چار سالہ زندگی کا نتیجہ ہے، کیونکہ جیسا معلوم ہے اس کے جز ہزار اشعار جو ایران کے قیام میں کہے گئے ضایع ہو گئے، موجودہ دیوان کا تقریباً کل حصہ ہندوستان کے قیام میں معرض داد میں آیا، تعاید تو تمام یہیں کے ہیں البتہ قصائد کا کچھ حصہ ممکن ہے کہ پرانا بھی ہو۔ اس کے کلام پر نظر ڈالنے سے مطالعہ کرنے والا حکم لگا دیگا کہ اس شاعر کی زندگی تمام تر ہندوستان میں گزری، چنانچہ براؤن جیسے محقق نے لکھ دیا ہے کہ "اگرچہ وہ شیراز میں پیدا ہوا اور وہیں اسکی پرورش بھی ہوئی لیکن اس کی مختصر زندگی زیادہ تر ہندوستان میں بسر ہوئی"، کیونکہ "کم سنی ہی میں وہ ہندوستان چلا آیا تھا"

عرفی ۹۹۴ھ سے ۹۹۹ھ تک ہندوستان میں رہا، ان چار پانچ سالوں میں اس کو یکسوئی غالباً بہت ہی کم نصیب ہوئی ہوگی۔ ہندوستان کے بیشتر حصوں کا اس نے اس زمانہ میں سفر کیا جب کہ آمد و رفت کی آسانیاں بہت کم تھیں۔ ۹۹۴ھ میں احمد نگر میں تھا۔ اسی سنہ کے آخر میں یا ۹۹۵ھ کے شروع میں وہ فتحپور سیکری پہونچا، اسی سال جبکہ فیضی، یوسف زئی پٹھانوں کی مہم پر سرحد کی طرف روانہ ہوا تو وہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں اس نے اٹک میں بھی قیام کیا ہوگا کیونکہ اکبر بادشاہ بھی ان دنوں کشمیر کی مہم کے قبل یہیں آگئے تھے۔ یہیں سے دوسرے سال اکبر، کشمیر کی سیر کو گئے عرفی اور فیضی بادشاہ کے ہمرکاب تھے۔ دونوں نے کشمیر کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ اسی سال یعنی ۹۹۷ھ ہی میں اکبر، پشاور میں تھے، فیضی بھی اس کے ساتھ تھا ممکن ہے عرفی بھی رہا ہو۔ لیکن اسی سال حکیم ابوالفتح فوت ہوا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ عرفی آگرہ واپس آگیا ہو۔ ۹۹۹ھ میں خان خاناں کے ساتھ وہ سندھ گیا، وہیں سے واپسی میں لاہور پہونچ کر شوال ۹۹۹ھ میں راہی ملک بقا ہوا۔

ایسی غیر مطمئن زندگی میں اسے کیا کیا پریشانیاں نہ اٹھانا پڑی ہوں گی۔ باوجود اس کے اس نے ایسے ایسے جواہر پارے چھوڑے ہیں کہ رہتی دنیا تک، ان کی روشنی دل کی آنکھوں کو جلا بخشتی رہے گی۔ اگر عرفی کی زندگی کے یہ چار سال نکال دئے جائیں تو اسکی حیثیت معمولی انسان سے کسی حالت میں بھی بلند نہیں رہ جاتی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر کچھ دنوں وہ اور زندہ رہ جاتا تو دنیا کے عظیم ترین شاعروں کی صف اول میں جگہ پاتا۔

وفات ۹۹۹ھ

عرفی کی وفات اور سنہ وفات کے بارہ میں مختلف قسم کی روایتیں ہیں۔ تمام تذکروں میں اس کی وفات کا سنہ ۹۹۹ھ ہجری قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ معتبر نہاوندی، ابوالفضل اور بدایونی کے اقوال ہیں۔ مآثر رحیمی میں لکھا ہے کہ تقی اوحدی نے اس کی تاریخ وفات "ہادی کلام عرفی شیرازی" سے نکالی ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تقی بھی نہاوندی کے ہم نوا ہیں۔ "ہمیشہ بہار" اور "ریاض الشعراء" میں بھی یہی تاریخ منقول ہے۔ لیکن اس کے مؤلف کا نام نہیں درج ہے۔ تعجب ہے کہ تقی کے تذکرہ میں عرفی کے حالات کے ذیل میں نہ اس کی تاریخ وفات ہی لکھی ہے اور نہ مذکورۂ بالا تاریخی قطعہ ہی مندرج ہے۔ تقی اوحدی کا یہ قطعہ یا عرفی کی وفات کے ۱۶ سال بعد ہندوستان میں لکھا گیا کیونکہ مؤلف کے ورود ہند کی تاریخ ۱۰۱۵ھ ہے، یا ایران میں مرتب ہوا۔

ابوالفضل نے اکبر نامہ میں عرفی کا انتقال ۹۹۹ھ کے ذیل میں لکھا ہے۔ بدایونی نے بھی یہی تاریخ درج کی ہے اور ساتھ ہی دو تاریخیں بھی لکھی ہیں "دشمن خدا" "جوانا مرگ شدے"۔ ان دونوں سے یہی سنہ برآمد ہوتا ہے۔ کلمات الشعراء اور ہمیشہ بہار میں عرفی کے کسی شاگرد کا فقرۂ تاریخ (استاد البشر) دیا ہے۔ مولانا آزاد نے آئمہ کرمیہ "متکئین فیہا علی الارایک" سے اس کے انتقال کی تاریخ نکالی ہے۔

ان کے علاوہ خان آرزو، ابراہیم خلیل، والہ وغیرہ بھی اسی قول کی تائید کرتے ہیں۔ سبھوں نے یہ لکھا ہے کہ انتقال کے وقت اسکی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ صرف مراۃ آفتاب نما اور نشتر عشق میں اس کی عمر ۳۵ سال کی تجویز ہوئی ہے۔ پروفیسر براؤن اور مولانا شبلی نے

اس کی وفات ۹۹۹ھ میں بیان کی ہے اور عمر ۳۶ سال تجویز کی ہے۔

بہرحال تاریخی قطعوں، ہم عصر شہادتوں، اور دوسرے مشہور تذکرہ نگاروں کے بیان سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ عرفی کی وفات کا سال ۹۹۹ھ ہے، مگر دو معاصر مؤلفوں کے قول نے ذرا اشکال پیدا کر دیا۔ ان میں ایک تقی کاشی، مؤلف خلاصۃ الاشعار اور دوسرے عبدالنبی صاحب میخانہ ہیں۔ اول الذکر نے عام رائے کے خلاف اس کا سنہ وفات ۱۰۰۲ھ قرار دیا ہے، البتہ میخانہ کے نسخوں میں اختلاف ہے، ایک نسخہ میں یہی تاریخ یعنی ۱۰۰۲ ہجری درج ہے، مگر دوسرے نسخہ میں ۱۰۲۰ھ لکھ کر بعد کو ۱۰۰۲ھ بنایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ یہ قول دونوں نسخوں میں بغیر اختلاف موجود ہے کہ (عرفی) کی عمر ابھی ۴۰ سال بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ فرشتۂ اجل نے رشتۂ زندگی قطع کر ڈالا، عرفی کی تاریخ پیدائش ۹۶۳ھ تجویز کی گئی ہے اس لحاظ سے ۱۰۰۲ھ میں اس کی عمر ۳۹ سال کی ہوتی ہے۔

عرفی نے لاہور میں انتقال کیا۔ بعض لوگ اس کی وفات کا سبب عارضۂ پیچش قرار دیتے ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاید اسے زہر دیا گیا، زہر دینے کا واقعہ ریاض الشعراء، تذکرہ مبتلا اور مراۃ آفتاب نما میں مذکور ہے، تینوں کے بیان سے صاف طور سے ظاہر ہے کہ شہزادہ سلیم سے بے حد خصوصیت تھی۔ بعض لوگوں کی نظر میں یہ محبت اس درجہ کھٹکی کہ عرفی کو بدنام کر ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عین جوانی میں حاسدوں نے اسے زہر دیدیا۔ اگرچہ اس پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے کہ عشق کا قصہ سراسر غلط اور خلاف قیاس ہے، لیکن زہر دینے کے بیان کی تردید کے لئے بظاہر میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ ممکن ہے واقعۃً ایسا ہی ہوا ہو۔ لیکن معاصر مؤلفین کی خاموشی کی وجہ سے ہم اس کو تسلیم نہیں کر سکتے۔

ہڈیوں کی منتقلی تمام تذکرے متفق ہیں کہ عرفی لاہور ہی میں مدفون ہوا، ہمیشہ بہار میں ہے کہ میر حبیب اللہ کے مقبرے میں اس کو دفن کیا گیا تھا۔ ریاض میں لکھا ہے کہ چند سال کے بعد کوئی درویش کسی اور بزرگ کے دھوکے میں اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر نجف لے گیا اور وہیں دفن کیں۔ لیکن یہ غلط ہے اس وجہ سے کہ اس کتاب میں رونقی کا وہ قطعۂ تاریخ منقول ہے جو اس نے اس واقعہ کے لئے نظم کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کی لاش دھوکے سے نکالی گئی تو پھر اس پر اہتمام کے ساتھ قطعۂ تاریخ لکھا جانا سراسر بے معنی ہے، دوسرے یہ کہ تمام تذکروں میں یہ بیان ہے کہ ایک قلندر کے توسط سے اس کی ہڈیاں نجف اشرف پہونچیں ان سب میں مآثر کا بیان[1] بہت صاف ہے:۔

"میر صابر اصفہانی نے جو ایک اچھا خاصہ شاعر ہے اور غیاث بیگ طہرانی کی خدمت میں ہے، ایک درویش کو رقم کثیر دی کہ مولانا عرفی کی لاش لاہور سے نجف اشرف پہونچا دے، اس بزرگ کی عرفی کی لاش کھود دی، اس کو مشہد لے گیا اور وہاں دو ماہ بطور امانت رکھا پھر نجف اشرف لے گیا۔ رشیدائے کاشی جو اس دور کا ایک مشہور شاعر ہے ۱۰۲۸ھ میں نجف میں موجود تھا۔ وہ ایک شخص سید حسین نقیب نجف کے پاس گیا اور مولانا کی لاش کو دفن کرنے کے لئے زمین کا طالب ہوا، وہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہوا اور ۳۰ سال کے بعد عرفی کی لاش کے ریزے مقام "بحیرہ" میں دفن ہوئے۔ اس کے بعد سید حسین نے جشن قایم کر کے غربا میں خاصی رقم تقسیم کی، انکا ارادہ

ایک مقبرہ طیار کرانے کا ہے۔"

اس کے بعد مولانا رونقی کا متذکرہ بالا قطعہ تاریخ ہے، جس میں "بکاوش مژہ از گور تا نجف آمد" سے اس واقعہ کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ بہرحال عرفی کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

بکاوش مژہ از گور تا نجف بردم اگر بہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار

میخانہ میں ایک دوسرا قول پایا جاتا ہے جس کا درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا:۔

"۱۰۲۷ھ میں ملک الشعرائے خراسان مرزا نصیحی نے ایک شخص کو لاہور بھیجا کہ وہ عرفی کی ہڈیاں مشہد مقدس لے آئے۔ لیکن اس شخص کے لاہور پہونچنے کے دس روز قبل ہی میر صابر اصفہانی ہڈیاں نجف اشرف پہونچا چکا تھا۔"

اس واقعہ کی تاریخ میں کسی قدر اختلاف ہے، مآثر کے بیان کے مطابق ۳۰ سال بعد یعنی ۱۰۲۹ھ میں اس کی ہڈیاں نجف اشرف میں مدفون ہوئیں، اس کی تائید مجمع النفائس، کلمات الشعراء، ہمیشہ بہار اور مخزن الغرائب وغیرہ تذکروں سے ہوتی ہے لیکن رونقی کے قطعہ سے جو بغیر اختلاف سب کتابوں میں مندرج ہے ۱۰۲۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ جب یہ قطعہ مآثر میں موجود ہے تو پھر اس واقعہ کو ۱۰۲۹ھ کا کیوں قرار دیا۔ اس میں مزید یہ بھی مذکور ہے کہ ۱۰۲۸ھ میں رشید اوہاں موجود تھا۔ حالانکہ خود مؤلف مآثر کے بیان کے مطابق اس تذکرہ کے اختتام کا سال ۱۰۲۵ھ ہے، ۱۵ جمادی الثانی ۱۰۲۶ھ میں اس کا مقابلہ کرکے کچھ حاشیے اور خاتمہ کا اضافہ کے ساتھ یہ کتاب خواجہ سلطان محمد اصفہانی کو پیش کی گئی۔ اس کے بعد ۲۳ رجب ۱۰۳۱ھ کو خواجہ سے لے کر اپنے مخدوم قاضی عبدالعزیز کے پاس بھیجی گئی لیکن مقابلہ نہ ہو سکا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں جمادی الثانی ۱۰۲۶ھ تک کے واقعات ہو سکتے ہیں۔ پھر ۱۰۲۹ھ کا واقعہ کیونکر مندرج ہوا یا اگر یہ واقعہ ۱۰۲۷ھ ہی کا ہو پھر بھی اس میں درج نہیں ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فوقتاً فوقتاً اس کتاب میں اضافہ ہوتا رہا ہے

نشتر عشق میں رونقی کا قطعہ درج ہے لیکن اس میں لکھا ہے کہ ۲۸ سال بعد عرفی کی ہڈیاں دوبارہ دفن ہوئیں۔ مگر میخانہ میں یہ قطعہ مندرج نہیں ۔۔ اوپر کی بحث سے بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس واقعہ کو ۱۰۳۰ھ کا سمجھنا چاہئے کیونکہ رونقی کے قطعہ سے یہی تاریخ برآمد ہوتی ہے ۔۔ عرفات العاشقین میں بھی اس کی دفات لاہور میں بتائی گئی ہے اور مزید یہ بھی لکھا ہے کہ وہیں اسکا مرقد بھی ہے۔ اس میں عرفی کی ہڈیوں کے نجف لے جانے کے واقعہ کو بالکل نہیں لکھا گیا۔ مؤلف ایسا کرنے میں حق بجانب ہے کیونکہ یہ تذکرہ ۱۰۲۲ھ اور ۱۰۲۴ھ کے درمیان لکھا گیا (حالانکہ اختتام کی تاریخ یہ ہے۔ بدو سال ایں نوی تمام شدہ۔ جس سے ۱۰۲۰ھ برآمد ہوتا ہے) اور یہ واقعہ اس کے تین سال بعد وقوع پذیر ہوا۔

عرفی نے انتقال کے وقت حسب ذیل رباعی لکھی:۔

عرفی دم نزع است و ہماں مستی تو آیا بچہ مایہ رخت بربستی تو
فرداست کہ دوست نقد فردوس بکف جویائے متاع ست وتہی دستی تو

ترتیب دیوان

تمام تذکرے معہ مآثر رحیمی کے متفق ہیں کہ عرفی نے خود ۹۹۶ھ میں ایک دیوان مرتب کیا جس میں ۲۶ قصیدے ۲۷۰ غزلیں اور ۷۰۰ شعر کے قطعات اور رباعیاں تھیں، اس دیوان کی خود ہی تاریخ کہی :-

این طرفہ نکات سحری و اعجازی — چوں گشت مکمل بہ رقم پردازی
مجموعہ طراز قدس تاریخش یافت — اول دیوان عرفی شیرازی

مگر میخانہ میں لکھا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی دیوان ترتیب نہیں دیا تھا۔ مرنے کے بعد اس کے ایک دوست نے مروجہ دیوان مکمل کیا۔ جس میں ساڑھے بارہ ہزار اشعار تھے۔ بہرحال یہ غلط ہے۔

عرفی نے جو دیوان مرتب کیا تھا وہ اس کی زندگی کا آخری کلام تھا۔ اس سے پہلے ۶ ہزار شعر کہے تھے۔ وہ بدقسمتی سے ضایع ہوگئے۔ اس کے ماتم میں ایک پر درد غزل لکھی جو تمام تذکروں میں منقول بھی ہے :-

عمر در شعر بسر کردہ و در باختہ ام — عمر در باختہ را بار دگر باختہ ام
رصد شرع ہنر چوں نہ شود محو کہ من — شش ہزار آیت احکام ہنر باختہ ام
گفتہ گر شد ز کفم، شکر کہ ناگفتہ بجاست — از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

آخری شعر میں کہتا ہے کہ اگر کہا ہوا جاتا رہا تو پروا نہیں، شکر ہے کہ بن کہا ہوا تو موجود ہے۔

عرفی جیسے خوش نصیب دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد اس کی ہڈیوں کے ریزے نجف اشرف پہونچتے ہیں اور اسی طرح انتقال کے ایک عرصہ بعد اس کا دیوان بڑے اہتمام کے ساتھ مدون ہوتا ہے، مآثر رحیمی کے بیان کے مطابق مرتے وقت اپنا دیوان جو اس کے ہاتھ کا مسودہ تھا۔ خان خاناں کے کتاب خانہ میں تدوین کی غرض سے بھیجدیا تھا۔ چنانچہ اسکی وفات کے ۲۵ سال بعد ۱۰۲۴ھ میں خان موصوف نے محمد قاسم سراجا کو اس کام پر مامور کیا، اس نے سال بھر کی محنت شاقہ کے بعد دیوان کی ترتیب پوری کی، اس میں کل ۱۴ ہزار اشعار تھے۔ موصوف نے محمد قاسم کو انعام سے مالامال کر دیا۔ سراجا نے ایک قطعہ میں ان واقعات کا ذکر کیا ہے جو مآثر میں منقول ہے اس قطعہ کے ذیل کے شعر میں تاریخ بھی موجود ہے۔

از خرد خواستم چو تاریخش — گفت ترتیب دادہ دیوانے

"ترتیب دادہ" سے ۱۰۲۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ صاحب مآثر نے اس پر دیباچہ لکھا تھا جس میں عرفی کی زندگی کے دلچسپ واقعات قلم بند کئے تھے افسوس کہ اب نایاب ہے۔

نشتر عشق میں ناظم تبریزی کے حوالے سے یہ واقعہ کسی قدر مختلف طور سے بیان ہوا ہے، ناظم نے لکھا ہے کہ مرنے سے قبل اس نے اپنا دیوان خان خاناں کو دیا کہ اس کی تدوین ہوجائے۔ ۱۰۳۰ھ میں اس نے ایک محرر کو اس کام پر مقرر کیا، وہ مسودات لے کر رفوچکر ہوگیا۔ ناظم نے حسن اتفاق سے اسے کہیں دیکھا اور مسودات واپس لینے میں کامیاب ہوگیا۔ اس میں ۱۵ ہزار اشعار تھے۔

بہرحال جو دیوان خان خاناں کے زیر اہتمام مدون ہوا اس میں بقول ناظم ۱۵ ہزار اشعار، اور بقول صاحب میخانہ ساڑھے بارہ ہزار اور بقول دیگر تذکرہ نویسان ۱۴ ہزار اشعار تھے۔ اس میں آخری قول صحت سے قرین ہے۔ کیونکہ اولاً تمام تذکروں سے اسکی تصدیق ہوتی ہے، ثانیاً مآثر رحیمی میں بھی یہی موجود ہے ثالثاً خود سراجا کا تاریخی قطعہ اس امر کا موید ہے، انھیں وجوہ سے دیوان کی ترتیب کی تاریخ بجائے ۱۰۳۰ھ کے ۱۰۲۶ھ سمجھنا چاہئے۔ ۱۰۲۶ھ مآثر کی تاریخ تصنیف ہے جس میں یہ قول پورے اعتماد کے ساتھ مذکور ہے۔

مولانا شبلی نے بہارستان سخن کے حوالے سے لکھا ہے کہ عرفی کا ضائع شدہ کلام بھی حاصل ہوا جو دیوان میں داخل کر دیا گیا مولانا کے نزدیک یہ بیان قرین قیاس ہے۔

کیرکٹر

عرفی ایک بلند ہمت، غیور اور خود دار انسان تھا۔ اس کے کلام میں یہی عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ مثلاً لکھتا ہے:-

اقبال کرم می گزد ار باب ہمم را — ہمت نہ خورد نیشتر لا و نعم را
از رغبت دنیا الم آشوب نہ گردم — زیں باد پریشاں نہ کنم زلف الم را
از نقش و نگار در و دیوار شکستہ — آثار پدید است صنادید عجم را
اما نہ بود وصف اضافی ہنر ذات — ایں فتوی ہمت بود ارباب ہمم را

قصاید میں شعرا کی مجال نہ تھی کہ اپنا ذکر کر سکیں، عرفی چونکہ بالطبع نہایت ہی غیور تھا اس لئے مدحیہ کلام میں اپنے فضایل اور اوصاف جی کھول کر بیان کرتا اور مزے لے لے کر کہتا ہے، شاید ہی کوئی قصیدہ ایسا ہو جس میں کافی شعر فخریہ نہ ہوں، چنانچہ کہتا ہے:-

خدایگانہ بگویم بہ مدح خویش دو بیت — کزاں نیارد و پرہیز کرد طبع سلیم

مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ اہل ادب نے انواع شاعری میں فخریہ کو ایک خاص صنف قرار دیا ہے، فارسی میں اس خاص صنف میں عرفی کا کوئی ہمسر نہیں۔ عجیب عجیب نئے اسلوب سے فخریہ لکھتا ہے اور اس جوش سے لکھتا ہے کہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے:-

نیم تحسین کمن ار گوید صد بیت بلند — کہ دماغش شدہ از حسن طبیعت مختل
گوہر آمالے رموزست نہ دریا و نہ کاں — حکمت آموز عقولست نہ علم و نہ عمل
انچہ ذرات معانی ست کہ بروے جوشند — ہمہ خورشید شود گر بشناسند محل
اگر او نامزد ننگ شد از ذلت شعر — شعر از عزت او نیک بر آید ز ذلل

مختصر یہ کہ عرفی کا کلام اس طرح کے مضامین سے بھرا پڑا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ عرفی کی آزادی طبع اور خود داری منجر بہ "کبر" ہو گئی تھی۔ چنانچہ تمام مولفوں نے اس کو بد دماغ، مغرور اور خود ستا لکھا ہے، اساتذہ سلف کو اپنے مقابلہ میں ہیچ سمجھتا ہے۔ جیسا کہ ذیل کے اشعار سے صاف ظاہر ہے:

انصاف بدہ بوالفرج وانوری امروز — بہرچہ غنیمت نہ شمارند عدم را

تفرجے کہ من از بہر روح ساز دہم نہ انوری نہ فلانے دہد نہ بہمانی

دم عیسی تمنا داشت خاقانی کہ برخیزد بہ امداد صبا اینک فرستادم بہ شروانش

پروفیسر براؤن کا قول ہے[1]

"ان موانع اور خود اپنی مسلمہ قابلیت کے باوجود عرفی کے ناقابل برداشت غرور اور بد دماغی نے اسے ہر دل عزیز نہ ہونے دیا اور اس کے کئی دشمن پیدا ہو گئے جو شاعر خود اپنے متعلق یہ دعویٰ کرے:

نازش سعدی بہ مشت خاک شیراز از چہ بود گر نہ می دانست باشد مولد و ماوائے من

وہ گویا خود اپنے ہاتھ تنقید اور تنقیص کے دروازے کھولتا ہے۔۔ اپنے ابنائے وطن میں مقبول نہ ہونے کی بڑی وجہ اسکی یہی بد دماغی ہے، کیونکہ ظاہر ہے ایرانی اپنی قوم اور اپنے مشاہیر ملک کی اس طرح توہین و تذلیل کیوں گوارا کرنے لگے۔"

لیکن ان اشعار میں جن کی بنا پر پروفیسر براؤن نے عرفی کو بد دماغ سمجھا ہے، اور جن کی وجہ سے پوری ایرانی قوم اور مشاہیر ملک کی توہین و تذلیل ہوتی، غرور اور نخوت کے بجائے شاعرانہ تعلی کو زیادہ دخل ہے، اور اگر جستجو کی جائے تو کم و بیش ہر شاعر کے یہاں اس طرح کے دو چار شعر ضرور مل جائیں گے

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ، اس میں خود رائی و خود ستائی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ بدایونی لکھتا ہے:۔

"اما از بس عُجب و نخوت پیدا کرد از دلہا افتاد"۔ یہ قول بھی عصبیت سے پاک نہیں، حالانکہ مولانا شبلی، بدایونی کو عرفی کا بڑا مداح سمجھتے ہیں، اگرچہ واقعہ ایسا نہیں ہے کیونکہ جو اس کی وفات کی تاریخ "دشمنِ خدا" سے نکالے وہ اس کا (عرفی) دوست کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔

ابو الفضل نے اس کے فخر و ادعا کو برا کہا ہے لیکن یہ بھی عرفی کا بڑا حریف تھا اس لئے اس کے قول میں صداقت کا عنصر کم سمجھنا چاہئے۔

"درے از سخن سرائے بر دکشودہ بودند در خود نگریست و بر پاستانیاں زبان طعن کشود، غنچہ استعداد نشگفتہ پژمرد"

حیرت ہے کہ جب عرفی کے "غنچۂ استعداد" کو "نشگفتہ" کہا گیا ہے تو پھر کونسا شاعر ہو سکتا ہے جس کی استعداد کو "شگفتہ" کہا جائے گا۔ مولف میخانہ نے اس سلسلہ میں بہت دلچسپ معلومات بہم پہونچائی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ عرفی میں بے ادبی کے سوا کوئی دوسرا عیب نہ تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ نظامی کی تحقیر کی وجہ سے اس کو برے نتائج دیکھنے پڑے یعنی

(۱) ابھی پورے چالیس سال کا بھی نہ ہوا کہ فرشتۂ اجل نے اس کی روح قبض کر لی۔

(۲) مرتے وقت کلمۂ شہادت کے بجائے بے معنی فقرات زبان پر جاری تھے۔ عرفی کے مرض الموت کے وقت مرزا نظام قزوینی جو کشمیر کے بخشی اور دیوان تھے اکبر بادشاہ کے حکم سے اس کے پاس گئے۔ مزاج دریافت کرنے پر اس کی حالت بے حد خراب پائی۔ اس کے منہ سے سوائے مزخرفات کے کچھ نہ نکل سکا۔

(۳) جب مؤلف مذکور عرفی کے حالات لکھ رہا تھا، ایک بزرگ اسکے کمرے میں داخل ہوئے اور مولوی معنوی کے حسب ذیل اشعار پڑھے :۔

از ادب پر نور گشتست ایں فلک — وز ادب معصوم و پاک آمد ملک
بد ز گستاخی کسوفِ آفتاب، — شد عزازیلے ز جرأت رجمِ باب
از خدا خواہیم توفیقِ ادب — بے ادب محروم ماند از لطفِ رب

مولف نے دل میں سوچا کہ یہ اشارہ ہے سوء جانب اللہ "بنا بر سروش غیبی"

(۴) صاحب میخانہ نے شب جمعہ میں خواب دیکھا کہ عرفی درویش مذکور کے ساتھ ایک پر فضا باغ میں ٹہل رہا ہے۔ مؤلف کو دیکھ کر مخاطب ہوا کہ حضرت شیخ نظامی کے ساتھ مجھ سے جو بے ادبی ہو گئی اس کی وجہ سے میں اس قدر پریشان ہوں کہ قیامت تک میرا سر نہیں اُٹھ سکتا۔ لیکن خدا کا ہزار شکر ہے کہ حضرت امیر المومنین کی مداحی کے صلہ میں میرے گناہ معاف ہو گئے اور حضرت شیخ نے بھی میری خطا در گزر کی، حضرت درویش نے آپ کے سامنے جو اشعار پڑھے تھے وہ ان کے پڑھنے میں حق بجانب تھے۔ وہ بزرگ اب میرے حال پر مہربان ہیں اور کل آپ کے پاس جائیں گے"۔

دوسرے دن دو نمازوں کے درمیان وہی فقیر مولف کے پاس آیا اور خواب کا واقعہ جیسا مولف نے دیکھا تھا ہو بہو بیان کیا۔

اس تمام تفصیل میں مولف کے اعتقاد کو بہت زیادہ دخل ہے، اجمالاً اس کی یہ ہے کہ عرفی نے بزرگان سلف کے ساتھ ادب کا برتاؤ نہیں کیا۔

عرفی نہایت ظریف الطبع اور بذلہ سنج تھا، اس کی حاضر جوابی کے سلسلہ میں شعر العجم میں دو واقعہ مذکور ہیں، ایک فیضی کے ساتھ واقع ہوا، دوسرا ابو الفضل کے ساتھ، اوپر اس پر مختصر بحث گزر چکی ہے کہ اول الذکر ممکن ہے کہ صحیح ہو، لیکن آخر الذکر سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔

عرفی نے کسی شخص کی ہجو سے اپنی زبان آلودہ نہ کی، البتہ اس کو یہ چیز نہایت ناگوار تھی کہ کوئی ایسی چیز تحفۃً بھیجے جو قابل پیش کش نہ ہو، ایک بار ظہوری نے معمولی شال عرفی کے پاس روانہ کی۔ اس نے جواب میں ایک طنز آمیز خط معہ تین رباعیوں کے جو شال کی ہجو کے بارے میں تھی، لکھا، اکبر بادشاہ نے اس کو ایک گھوڑا انعام میں دیا چنانچہ ایک رباعی اس گھوڑے کی ہجو میں سپرد قلم کر کے روانہ کر دی۔

عرفی کی زندگی فسق و فجور سے پاک تھی۔ ایک بار کسی نے اس پر فسق کا الزام دیا جس کا اسے بے حد صدمہ ہوا اور ایک قطعہ میں اس کا اظہار کیا اور خاتمہ میں ایسے دل کو تسلی دی۔

غرض عرفی جیسے بلند پایہ شاعر اور خود دار انسان بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔

(ڈاکٹر) نذیر احمد ام۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔

عہد عباسی کا ایک تاریخی واقعہ

(جسے تاریخ نے نظر انداز کر دیا)

عباسی خلیفہ "المتوکل علے اللہ" مسند پر جلوہ افروز ہے سامنے ایک نہایت حسین کنیز (سناء) سر جھکائے مودب کھڑی ہے، اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں شکر و مسرت کے آنسو جھلک رہے ہیں۔

خلیفہ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا:۔ "کل میں تیرا گانا سنکر بہت خوش ہوا اور خصوصیت کے ساتھ تیرا وہ نغمہ تو مجھے بہت پسند آیا جو تو نے روم میں سیکھا اور وہیں کی زبان میں سنایا۔ یہ زیور لے۔ میں تجھے اظہار خوشنودی میں دیتا ہوں"۔

سناء نے یہ سنکر نہ اپنا سر اُٹھایا نہ کوئی بات کی، بلکہ اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔

خلیفہ بولا :۔ "اے سناء، اگر تو کچھ اور چاہتی ہے تو بتا وہ کیا ہے"۔

سناء نے نہایت نرم و شیریں آواز میں جواب دیا کہ "امیر المومنین کے لطف و کرم نے اس کنیز کو اتنا کچھ دے رکھا ہے کہ اب اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں، لیکن اے میرے آقا، میرے دل میں ایک بات ہے جو میں اس وقت کہنا چاہتی ہوں"۔

خلیفہ نے کہا:۔ "ضرور کہو اور اگر وہ کوئی راز ہے تو بھی مجھ سے نہ چھپاؤ"۔

سناء بولی کہ:۔ "اگر امیر المومنین کی زندگی خطرہ میں نہ ہوتی، تو شاید میں اسے ظاہر نہ کرتی، لیکن ایسی صورت میں، اس کو چھپانے کی قدرت مجھ میں نہیں ہے"۔

خلیفہ نے حیرت سے کہا کہ:۔ "اے سناء، جلدی کہہ وہ کیا بات ہے، کیا خطرہ ہے جو میری جان سے تعلق رکھتا ہے"۔

سناء نے کہا کہ "اے میرے آقا، آپ اُس نصرانی طبیب سے ہوشیار رہیں، جس پر آپ کو اس قدر اعتماد ہے اور جس پر امیر المومنین انعامات کی بارش فرماتے رہتے ہیں، وہ آپ کی ہلاکت کی فکر میں ہے کیونکہ آپ اسکے ہم مذہب لوگوں پر سختی کرتے رہتے ہیں"۔

خلیفہ نے حیرت سے پوچھا:۔ "کیا تو حُنین العبادی کے متعلق ایسا کہتی ہے"۔

اس نے جواب دیا :۔ "ہاں، اے میرے آقا، وہی"۔

خلیفہ نے کہا:۔ "تعجب ہے میں نے تو ملک کے تمام علماء و اطباء میں اُسے سب سے اونچی جگہ دے رکھی ہے اور میں اپنی نصاریٰ رعایا پر سختی بھی نہیں کرتا، البتہ جو کسی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں انھیں ضرور سزا دیجاتی ہے"۔

سناء بولی کہ "اے میرے آقا یہ درست ہے، لیکن حُنین تو ایسا ہی سمجھتا ہے کہ آپ نصاریٰ پر ظلم کرتے ہیں اور اس لئے وہ آپ کی ہلاکت کی فکر میں ہے۔ بہرحال اس کنیز کی التجا یہی ہے کہ امیر المومنین ہوشیار رہیں، ممکن ہے حُنین دوا یا غذا میں کسی وقت زہر ملا کر کھلا دے"۔

یہ سُنکر امیر المومنین کے دل میں بھی اندیشہ پیدا ہوگیا اور سوچنے لگا کہ حقیقت کا علم کیونکر ہو سکتا ہے اور اس راز کے بے نقاب ہونے کی کیا صورت ہے۔

سناء، نہایت حسین کنیز تھی اور اس قدر خوش آواز کہ جو شخص اس کا گانا سنتا مسحور ہو جاتا۔ روم کے بردہ فروش اسے پکڑ کر دار الخلافہ میں لے آئے تھے اور یہیں وہ "کنیز روم" کے نام سے قصر امارت میں داخل ہوئی تھی۔ خلیفہ اسکی بڑی قدر کرتا تھا اور جس وقت وہ رومی گانے سناتی تھی تو مست ہو جاتا تھا۔

طبیب کا نام جس کی شکایت کی گئی تھی ابو زید حنین بن اسحاق العبادی تھا اور حیرہ کی نصاریٰ جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ دوا سازی کی دوکان رکھتا تھا اور اسنے اپنے لڑکے حُنین کو یوحنا بن موسویہ کی خدمت میں تحصیل علم طب کے لئے بھیجدیا تھا۔ لیکن کچھ دن بعد یہ یوحنا سے خفا ہو کر اپنے وطن گیا اور وہاں سے بلاد روم کا سفر کیا۔ یہاں اس نے یونانی زبان حاصل کر کے مختلف علوم میں مہارت پیدا کی اور یونانی کتابوں کا ترجمہ سریانی اور عربی زبان میں کیا۔

مامون الرشید کا آخری زمانہ تھا جب وہ بغداد آیا اور دفتر ترجمہ سے متعلق ہوگیا، اس نے فن طب کی بڑی خدمت انجام دی اور طبیب حاذق کی حیثیت سے بہت مشہور ہوگیا۔ جب خلیفہ المتوکل علی اللہ کا زمانہ آیا تو اس نے بہت عروج حاصل کیا اور خلیفہ نے علاوہ قیمتی عطایا کے زمین کا ایک بڑا رقبہ بھی جاگیر میں دیدیا۔

حُنین :۔ "امیر المومنین نے مجھے یاد فرمایا تھا اس لئے میں حاضر ہوا ہوں اور ارشاد گرامی کے سننے کا منتظر ہوں"

خلیفہ :۔ "ہاں، اے حُنین میں نے تجھے ایک بڑی اہم خدمت انجام دینے کے لئے طلب کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی شخص اس خدمت کو انجام نہیں دے سکتا"۔

حُنین :۔ "اے امیر المومنین، یہ خاکسار ہر خدمت کے لئے حاضر ہے، ارشاد ہو"۔

خلیفہ :۔ "اے حُنین تم جانتے ہو کہ میرے دشمن بہت ہیں اور بغاوت کے لئے وقت کے منتظر ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ قبل اس سے کہ وہ مجھ پر قابو پائیں، میں ان کا فیصلہ کر دوں"۔

حُنین :۔ "امیر المومنین کا یہ خیال بالکل درست ہے اور اس سے زیادہ مسرت میرے لئے کیا ہو سکتی ہے کہ میں امیر المومنین کی تدابیر کو کامیاب بنانے میں مدد کروں۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ دشمن کون ہیں اور ان کا شر دور کرنے کی کیا تدبیر

امیر المومنین نے سوچی ہے۔"

خلیفہ :۔ "اب یہ نہ پوچھو کہ دشمن کون کون ہیں، تم تو ان کا شر دور کرنے میں میری مدد کرو اور وہ یہ ہو سکتی ہے کہ تم مجھے نہایت مہلک زہر طیار کر کے دو۔"

حُنین :۔ "اس میں شک نہیں میں نے حصول طب میں کافی وقت صرف کیا ہے اور علوم کیمیاوی کی تحقیق میں بھی بڑا سر کھپایا ہے لیکن اے امیر المومنین، خطا معاف، میں نے زہر طیار کرنا نہیں سیکھا۔"

خلیفہ :۔ "اے حُنین، میں تجھ کو پانچ ہزار دینار دیتا ہوں، جس طرح ممکن ہو اس کام کو انجام دو۔"

حُنین :۔ "اے امیر المومنین، باور فرمائیے کہ مجھے صرف انھیں دواؤں کا علم ہے جو موت سے بچانے والی ہیں اور موت لانے والی دواؤں کی طرف سے میں بالکل جاہل ہوں۔"

خلیفہ :۔ "کیا تو انکار کرتا ہے"

حُنین :۔ "ہاں، انکار کرتا ہوں، اس لئے کہ یہ میری قدرت سے باہر ہے۔"

اس گفتگو کے ختم ہونے کے بعد ہی ایک گھنٹہ کے اندر حُنین قید خانہ میں تھا جہاں اسے طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائی جا رہی تھیں جب صبح ہوئی تو خلیفہ نے اسے پھر طلب کیا اور پوچھا :۔ "کیا تو ابتک اپنی ضد پر قایم ہے۔" اس نے جواب دیا کہ "اے امیر المومنین یہ ضد و نافرمانی نہیں ہے، بلکہ استقامت ہے اس عہد پر کہ میں صرف وہی دوائیں بناؤں گا جو موت سے بچانے والی ہیں اور ہلاک کرنے والی چیزوں کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔"

خلیفہ نے یہ سنکر کہا کہ "بہتر ہے، اب تم اپنی موت کے لئے طیار ہو جاؤ کیونکہ میں تمہارے قتل کئے جانے کا حکم دے رہا ہوں"

حُنین نے کہا کہ "امیر المومنین کو اختیار حاصل ہے، میں مر سکتا ہوں لیکن کسی کو مار نہیں سکتا۔"

یہ سُن کر خلیفہ مسند سے اُٹھ کھڑا ہوا اور حُنین کو اپنے گلے لگاتے ہوئے بولا کہ "اے حُنین، میں تو صرف تیری شرافت اور علوئے نظر کا امتحان لے رہا تھا اور شکر ہے کہ تو اس میں کامیاب ثابت ہوا" اور یہ کہکر خلیفہ نے اس کو ہدایا و عطایا کی بارش سے اور زیادہ گرانبار کر دیا۔

خلیفہ حسب معمول دربار میں جلوہ افروز ہے، سناء اور حُنین دونوں سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور وہ ان دونوں کی صورت دیکھ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد خلیفہ نے سناء سے مخاطب ہو کر کہا :۔ "اے سناء تو اس شخص کو جانتی ہے" لیکن اس کا کنیز نے کوئی جواب نہ دیا، اس کے بعد خلیفہ نے حُنین سے کہا "اے حُنین، یہ کنیز کہتی ہے کہ تم مجھے زہر دیکر ہلاک کرنے کی فکر میں ہو، کیا یہ صحیح ہے۔"

حُنین نے کنیز سے مخاطب ہو کہا۔ "اے انستاسیا، کیا یہ صحیح ہے"۔

خلیفہ کنیز کا یہ نیا نام سنکر حیران رہگیا اور حُنین سے پوچھا کہ کیا تو اس سے واقف ہے اور تو نے اس کا یہ نام کیونکر جانا"۔

لیکن حنین کے جواب دینے سے پہلے ہی سناء، خلیفہ کے قدموں پر گر پڑی اور رو رو کر کہنے لگی کہ "اے امیرالمومنین، میں قصوروار ہوں اور میں نے اس پر تہمت لگائی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں بہت چھوٹی تھی جب بحر روم کے ایک ساحلی مقام پر اس سے متعارف ہوئی۔ یہ اُس وقت وہاں کے علمائے طب سے جن میں میرا باپ بھی شامل تھا طب پڑھ رہا تھا۔ مجھے اس سے محبت ہوگئی لیکن اس نے میری محبت کو رد کر دیا اور کہا کہ "میں اپنے وطن ہی کی عربی لڑکی سے شادی کروں گا"۔ یہ سن کر مجھے سخت صدمہ ہوا۔ اس کے بعد میں اپنے باپ کے گھر سے بھاگ گئی اور حیرہ کی طرف جانے والے ایک قافلۂ تجار کے ساتھ مل گئی۔ تاکہ حیرہ پہونچکر پھر اس سے ملوں، لیکن حیرہ پہونچکر معلوم ہوا کہ وہ بغداد میں ہے اس لئے میں بغداد کی طرف چل پڑی، لیکن راستہ میں کُردوں کے ایک گروہ نے مجھے گرفتار کر لیا اور میں کنیز کی حیثیت سے امیرالمومنین کی خدمت میں پہونچ گئی۔ یہاں پہونچکر جب مجھے معلوم ہوا کہ جس کے پیچھے میں تباہ ہوئی تھی وہ یہیں ہے اور صاحب اہل و عیال بھی ہے تو آتش انتقام میرے دل میں بھڑک اُٹھی اور اس لئے میں نے اس پر تہمت لگائی تھی"۔

یہ کہکر وہ حُنین کی طرف مخاطب ہوئی اور بولی کہ "اے حُنین، یقین کر کہ جس طرح تجھ سے جدا ہو کر میری محبت مر چکی تھی اب تجھے دیکھ کر میری نفرت بھی ختم ہوگئی ہے اور میں اپنے آقائے ولی نعمت کے سامنے اپنی خطا کا اعتراف کرتی ہوں"۔

خلیفہ نے طبیب سے پوچھا "اے حُنین کیا تم اس کی غلطی کو معاف کر دو گے"۔

حُنین نے کہا "اگر امیرالمومنین معاف فرما دیں تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے"۔

خلیفہ نے سناء سے کہا کہ "میں اور حُنین دونوں تیری خطا سے درگزرتے ہیں، لیکن آیندہ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا"۔

سناء جو اس وقت فرط تاثر سے زار زار رو رہی تھی حُنین سے مخاطب ہو کر بولی کہ "اے حُنین اب میری صرف ایک التجا ہے اور وہ یہ کہ تم امیرالمومنین سے مجھے مانگ لو تاکہ میں باقی عمر تمھاری خدمت میں بسر کر دوں اور تمھارے بچوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں"۔

خلیفہ نے یہ سنکر کہا کہ "اے سناء، میں تجھے آزاد کرتا ہوں اور اگر تو چاہے تو حُنین کے ساتھ جا سکتی ہے"۔

سناء، حنین کے ساتھ چلی گئی اور حُنین کی زندگی بھر ۲۶۴ھ تک برابر اس کی خدمت کرتی رہی۔

ایک ذاتی کتب خانہ فروخت ہو رہا ہے

جس میں بعض نہایت نادر کتابیں ہیں — ذیل کے پتہ سے خط و کتابت کیجئے:-

ام - عبدالحمید نعمانی - پوسٹ بکس ۴۹ — راولپنڈی

جذبات عالیہ اور اُردو شاعری

۱۔ انسان، فطرت، زندگی، ماحول و کائنات ۔ یہی وہ پانچ موضوع فکر و ادب ہیں جن کی وسعتوں کی کوئی انتہا نہیں، اور مفکرین زیادہ تر انھیں پر غور کرتے ہیں، لیکن ان سب میں اہم ترین موضوع خود انسان ہے۔

۲۔ انسان نہ عقل ہی عقل ہے اور نہ محض جذبات کا پتلا، وہ عقل کی مدد سے چیزوں کی ماہیت اور اشیاء عالم کی حقیقت پر غور کرتا ہے اور وجدان کی راہ سے اپنے جذبات کو اُبھارتا اور پھر ان سے خوشی یا غم محسوس کرنے لگتا ہے، چنانچہ قدیم کتابوں میں جابجا یہ بات نظر آتی ہے کہ انسان نے کائنات کی اشیاء پر غور کرتے کرتے جذبات کی راہ سے، خیال کی دنیا بسائی اور اُس میں ایسی لذت محسوس کی کہ ان تحریروں کو آسمانی حیثیت دیدی۔ رگوید مقدس کے گیتوں، زبور کے نغموں میں یہی بات آپ کو ملے گی۔

۳۔ انسانی جذبات کو بہترین طریقے پر پیش کرنے کا کام فنون لطیفہ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اگرچہ افلاطون نے چیزوں کی افادیت کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہوئے فنونِ لطیفہ کو غیر ضروری ٹھہرایا، یہاں تک کہ اس نے شاعری اور شاعر کو اپنے مجوزہ دستور "ریاست" سے خارج کر دیا، لیکن انسان نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا کہ احساسات کی نزاکتوں اور جذبات و تاثرات کو کامل طور پر محفوظ کرنے کا طریقہ فنون لطیفہ ہی ہیں اور ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ شاعری۔ افلاطون نے یہ کہکر کہ "شاعری نقل کی نقل ہے" اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے شاگرد ارسطو نے اپنی معرکہ آرا تصنیف بوطیقا میں نظریۂ شعر کی کافی تردید کر دی ہے۔

شاعری پر غور کرتے وقت زمانۂ گزشتہ کے نقاد زیادہ تر بحث کی ابتدا افلاطون کے نظریۂ نقل (Theory of Imitation) سے کرتے رہے ہیں اور تسینگ تک یہی رنگ فکر غالب رہا، لیکن رفتہ رفتہ تحقیق و تجسس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شاعری اور فنونِ لطیفہ کا اظہار فطرت انسانی کے بنیادی اُصولوں کے تحت کئی وجوہ سے ضروری اور ناگزیر تھا اور وہ اس لئے کہ شاعری اور فنونِ لطیفہ کا سرچشمہ، عقل محض نہیں، وجدان ہے، جس کا طریق کار عقل سے جداگانہ ہے۔

انسانی ذہن میں دو مختلف صلاحتیں ہیں: عقل اور وجدان۔ عقل کا کام حقایق و معلومات کو بغیر آمیزشِ جذبات کے فراہم کرنا اور نتائج حاصل کرنا ہے۔ بہ خلاف اس کے وجدان کی راہ، عقل سے ایک حد تک مختلف ہے۔ وہ چیزوں کی ماہیت کے مطالعہ میں ذہن کی ان قوتوں سے بھی مدد لیتا ہے جن سے سائنس وغیرہ میں بالکل مدد نہیں لیجاتی ——— اسی لئے شاعری جس لطافت کا مطالبہ کرتی ہے، وہ عقل محض کی خشکی میں نشوونما نہیں پا سکتی۔

ہر بلند شاعری میں شفائی قوت (Healing Power) اور سکون بخش صفات کی موجودگی ضروری ہے مثلاً نرمی و لطافت، نزاکت و معصومی، گم شدگی، وغیرہ وغیرہ، اس میں حقایق کا سا تلاطم اور افکار کا انتشار نہ ہونا چاہیئے ورنہ وہ اس خاموش تبسم کو کھو دیگی جو طلوع سحر یا غروب آفتاب کی طرح اس میں ہونا چاہیئے، یہ صفتیں اس وقت تک صحیح طور پر پرورش پا نہیں سکتیں جب تک وجدان کے نور کی ہدایت، فکر شاعر کی دستگیری نہ کرے۔ عقل محض سے یہ راہ طے نہیں ہوتی۔

وجدان کی حکمرانی کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ عقل کو شاعری سے بالکل خارج کر دیا جائے کیونکہ انسانی ذہن کی کوئی قوت شاعری کی دنیا سے الگ نہیں کی جا سکتی۔ انسانی زندگی میں ہم برابر یہ محسوس کرتے رہتے ہیں کہ کہیں عقل، وجدان پر غالب آجاتی ہے اور کبھی وجدان عقل پر۔ اسی طرح شاعری میں بھی یہی جنگ و جدل جاری ہے

شاعری اور جذبات میں وہی رابطہ ہے جو جسم و روح میں جس طرح روح کی پاکیزگی اور نفس و ضمیر کی طہارت پر وجود کی عزت و قدر و منزلت کا انحصار ہے۔ اسی طرح جذبات کی شعری صداقت و بلندی پر شاعری کی قدر و قیمت بڑی حد تک منحصر ہے۔ اُردو شاعری میں جان صاحب، سعادت یار خاں، رنگین اور میاں چرکین کے کلام کو جو کم و بیش حاصل ہے اس کا خاص سبب یہی ہے کہ ان کے جذبات میں وہ بلندی و رفعت موجود نہیں، جو میر و غالب، ولی اور مومن کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

مشہور انگریزی شاعر شیلی (Shelley) کی رائے میں شاعری جذبات کی مصوری کا نام ہے اور کارلائل کی نظر میں شاعری موسیقیانہ خیال ہے۔ گویا ان دو ناقدوں کی نظر میں شاعری میں حسب ذیل صفات ہونا چاہیئے:۔ (۱) جذبات۔ (۲) مصوری۔ (۳) موسیقی اور (۴) خیال و افکار

بے شک اگر شاعری، جذبات کی صداقت و رفعت، پاکیزگی اور لطافت، آئین مصوری و کمال موسیقی اور تازگی فکر و خیال پر نظر رکھے تو وہ فنون لطیفہ کی بہترین نمایندہ بن جائے گی۔ بشرطیکہ وہ ان اوصاف سے بھی متصف ہو، جو شعری صنعت گری کے لئے ضروری ہیں، چنانچہ انگریزی میں ٹنی سن کی نظم (Sleeping Beauty) "حسن خوابیدہ" اور اُردو میں اقبال کی متعدد نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں صداقت جذبات اور خیال و افکار کی تازگی غیر معمولی شگفتگی پیدا کر رہی ہے۔

شاید کہا جائے کہ اُردو شاعری، جذبات کی رفعت اور احساسات کی نزاکت و پاکیزگی کی جو مثالیں پیش کر رہی ہے وہ جدید شاعری کا نتیجہ ہیں جن پر مغربی ادب و شعر کا گہرا اثر ہے۔ بے شک مغربی شاعری نے آزاد اور حالی کی وساطت سے مشرقی شاعری کو متاثر کیا تاہم قدیم اُردو شاعری میں بھی انسانی فطرت کی تنقید و ترجمانی اور جذبات عالیہ کی عکاسی و مصوری انتہائی کمال سے کی گئی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہو گیا — میر

خانہ خراب عشق نے دُنیا سے کھو دیا — کیا پوچھتے ہو حال ہمارا سُنا نہیں — فغاں

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر — کیا دوانہ نے موت پائی ہے — میر

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا — میر

غیر سے ملنا تمہارا سن کے گو ہم چپ رہے — پر سنا ہوگا کہ تم کو اک جہاں نے کیا کہا — قائم

میرے غم خانہ کی قسمت جب رقم ہونے لگی — لکھدیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے — غالب

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو — "

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں — انشا

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ — چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے — انیس

ان اشعار کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر بہ آسانی پہونچ سکتے ہیں کہ شاعری فطرت انسانی کے چہرے سے نقاب اٹھا دیتی ہے اور ہمیں چھوٹی چھوٹی باتیں بہت انوکھی اور دلچسپ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ہمارے قدیم غزل گو شعراء نے انسانی فطرت کی صداقتوں اور حیات انسانی کی سچائیوں کو جس اختصار اور جامعیت سے بیان کیا ہے، اس کی مثال مغربی شاعری میں مشکل ہی سے مل سکتی ہیں۔ مغربی شعراء کا طرز بیان زیادہ تر بیانیہ ہوتا ہے۔ پہلے وہ کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں اور پھر اپنے تاثرات و احساسات پیش کرتے ہیں۔ اہل مغرب کا دل و دماغ عموماً واقعہ بینی اور تجزیہ پسندی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے مشرق کے نازک خیال شعراء اپنے ذاتی تاثرات کے اظہار پر زیادہ توجہ کرتے ہیں۔

ہماری قدیم شاعری کے یہ نمونے صاف طور سے یہ بات واضح کرتے ہیں کہ:- (۱) انسانی فطرت کی بہترین ترجمانی ان میں جا بجا موجود ہے (۲) کائنات کو جس وجدانی اور شعری نگاہ سے ان شعراء نے دیکھا، اس میں اچھی خاصی وسعت اور گہرائی ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جو وسعت اور تنوع انگریزی شاعری میں ملتا ہے، وہ اردو غزل گوئی میں موجود نہیں ہے۔ لیکن جہانتک گہرائی کا تعلق ہے اردو شاعری مغربی شعر و شاعری سے کسی طرح کم نہیں اور اردو کے ممتاز شعراء نے جب فطرت و حیات کی طرف توجہ کی تو فکر و تخیل کی مدد سے جو اشعار ظہور میں آئے، وہ انسان کے جذبات عالیہ کو تسکین دینے کے لئے آج بھی موثر ہیں۔ مثلاً میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے وہ حصے جہاں وہ عاشق شہزادی کے جذباتِ الفت کی ابتدائی حالت کی مصوری کرتے ہیں یا مثنوی زہر عشق کے وہ اشعار جن میں "اس کی" وفات اور وصیت کا ذکر ہے؟ یا یہ اشعار:-

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق ہے اس کارگہ شیشہ گری کا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم — یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری — نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے! — نہ کھینچو تم جو اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا ہم سے ہی حال تباہ اپنا دکھایا نہ گیا
مہ نے آسامنے شب یاد دلایا تھا اُسے، پھر وہ تا صبح میرے جی سے بھلایا نہ گیا

رواج عشق کے آئیں وہی ہیں کشور دل میں رہِ رسم و وفا جاری جو آگے تھی سواب بھی ہے
گو ہاتھوں میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم سے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں،
وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ہم کو حریص لذت آزار دیکھکر
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

اُردو شاعری کا گراں بہا سرمایہ غزل ہے اور اس لئے ان کی غزلیہ شاعری زیادہ تر داخلی شاعری ہے چونکہ اہل مشرق کا فطری میلان یہی ہے کہ وہ داخلیت سے زیادہ دلچسپی نہیں۔ پھر چونکہ اہل مشرق فلسفیانہ مسایل میں ( ) کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے اور شعر و ادب میں واقعہ نگاری سے زیادہ خیال آرائی پر توجہ دی اسلئے یہاں کی شاعری میں رزمیہ واقعات کو وہ جگہ نہ مل سکی جو یونان میں ہومر کی بدولت حاصل ہوئی۔ یہاں دل کی آنکھ سے کام زیادہ لیا گیا ہے اور وہاں چہرہ کی آنکھ سے۔ یہی سبب ہے کہ مغربی شاعری میں بیانیہ اور واقعاتی شاعری کا جو سرمایہ ہے وہ ہمارے یہاں موجود نہیں۔ اگر فردوسی کی شاہنامہ، والمیک کی رامائن اور میر انیس کے مراثی کو نظر انداز کر دیا جائے تو مشرق میں یقیناً بیانیہ اور رزمیہ شاعری کی کمی محسوس ہوگی ـــ تاہم معیار اور پختگی کے اعتبار سے مشرق کی بیانیہ شاعری بھی کم گرانقدر نہیں۔

جب اُردو شاعری نے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تو ماحول کی صعوبتوں نے اس کی راہ میں دقتیں پیدا کر دیں نتیجہ یہ ہوا کہ خارجی شاعری کا نشوونما ارتقاء زیادہ نہ ہو سکا۔ سیاسی طوائف الملوکی نے افکار و خیالات میں وہ تازگی اور وحدت و پختگی پیدا نہ ہونے دی جو یوروپ کے بعض شعراء مثلاً ڈانٹے، گوئٹے، ورڈس ورتھ اور کیٹس کے یہاں پائی جاتی ہے ہمیں اس کا کھلا ہوا اعتراف ہے کہ وہ پختگی فکر اور حکیمانہ نظر جو شیکسپیر اور ملٹن وغیرہ کے کلام میں پائی جاتی ہے، اُردو شعراء میں کم ہے، میر اور غالب نے البتہ فلسفہ الٰہیات اور تصوف سے مدد لی اور بعض عمدہ باتیں کہہ گئے۔ مثلاً جبر و اختیار کا مسئلہ کہ انسان مجبور محض ہے اور خدا فاعل مختار۔ میر نے اس کو یوں ادا کیا ؎

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی، جو چاہیں ہیں سو آپ کریں ہے ہمکو عبث بدنام کیا

یہ خیال کہ صاحب فکر و نظر صدیوں میں کہیں جاکر پیدا ہوتا ہے۔ میر کی شاعری میں اس طرح محفوظ ہے :۔

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردوں سے انسان نکلتے ہیں

یا یہی خیال اخلاقی نقطۂ نظر سے اس طرح کہ :

میر صاحب تم فرشتہ ہو تو ہو آدمی ہونا بڑا مشکل ہے میاں !

غالب کا یہ شعر لیکن دوسرے نقطۂ نظر سے :-

بسکہ دشوار ہے ہر چیز کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہ خیال کہ توحید خالص کا لازمی نتیجہ رسوم سے احتراز ہے، غالب کے یہاں اس آب و رنگ سے آراستہ ہے :-

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم　　ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یہ خیال کہ جب کچھ نہ تھا تو خدا تھا یعنی ایک ہستی قدیم ازلی ہے، جب کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ـــــ غالب کے نگارخانۂ ادب میں شعر و سخن کے دلکش لباس میں یوں آراستہ کیا گیا :-

نہ تھا جب کچھ خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

تصوف کا مشہور مسئلہ ہے کہ ہستی مطلق کا جلوہ اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب نفس معرفت میں کمال حاصل کر لیا جائے، میر نے اس خیال کو شعری حُسن صنعت گری کے ساتھ اس طرح پیش کیا :-

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم　　یک شعلہ برق خرمن صد کوہ و طور تھا

مایا فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ہستی فریب ہے، اس سے الگ ہی رہنا بہتر ہے۔ ہندوستانی تصوف کا یہ خیال اُردو شاعری اور ادب میں بھی بہت مقبول ہے، چنانچہ غالب اس خیال کو اس طرح پیش کرتا ہے گویا اس میں ان کی زندگی کا تجربہ بھی پوشیدہ ہے :-

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب کے اس شعر میں قنوطی رنگ کے باوجود، وہ وقت شفا موجود ہے جو غمگین دلوں کو تسکین اور ربودگی کی لذت بخشی ہے اور یہی باعظمت شاعری کی بڑی خوبی ہے۔

کیٹس نے لکھا ہے کہ ایک اچھی نظم میں چند خصوصیات کا ہونا ضروری ہے (۱) خیال کی ابتدا اس طرح ہو جیسے طلوع سحر کے وقت مہر عالم تاب کی پُرسکون آمد (۲) نظم میں خیال کا عروج فطری رفتار سے ہو اور (۳) نظم کا اختتام اس طرح ہو کہ فن کاری کی رنگینیوں اور شعر کی معنوی تاثیر میں ہماری روح سکون اور اطمینان محسوس کرنے لگے اور یہ خصوصیات ہم کو اُردو شاعری میں اکثر نظر آتی ہیں ـ اور میر ـ درد ـ ذوق ـ مومن ـ انیس ـ آتش اور غالب کے یہاں اس کی مثالیں بہت ملتی ہیں ـ

اس میں شک نہیں کہ انھوں نے شاعری کو وہ وسعت تو نہیں بخشی جو شیکسپیر، اسپنسر اور ملٹن سے انگریزی کو نصیب ہوئی لیکن خالص عشقیہ شاعری میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے ـ

ہماری شاعری میں نظیر، میر حسن ایسے شاعر ہیں جن کی طبیعت میں خارجیت پسندی

زیادہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ماحول و معاشرت پر اس طرح غور کیا جیسے ناول نویس انسانی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے کوئی شک نہیں کہ میر انیس نے رزمیہ جذبات کو مراثی میں عمدہ طریقے پر ظاہر ہے لیکن سچ پوچھئے تو ان کی شاعری مرثیہ نگاری کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ نہ رزمیہ جذبات کی ترجمان ہے نہ عشقیہ داستان و تاثر کی بلکہ وہ شدید مخلصانہ اظہار ہے ان اشکہائے درد و الم کا جو شاعر کو حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا تصور کر کے بے چین کئے دیتے ہیں۔ ان کی فن کاری اور موضوع سخن سب سے جدا ہے۔ انیس اپنے جہان سخن کو خود آباد کرتا ہے اور یہی ہر صاحب نظر فن کار کی انفرادیت ہے!

جذبات عشق کا تجزیہ اُردو میں میر حسن اور نظیر اکبر آبادی، پنڈت دیا شنکر نسیم اور مرزا شوق لکھنوی سے بہتر اور کوئی نہ کر سکا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے کلام میں عریاں نگاری کا عیب ہو، لیکن ان کی جذبات نگاری میں خیال کی صداقت اور فطری تازگی ضرور ملے گی۔ میر حسن، نظیر اکبر آبادی اور مرزا شوق لکھنوی اُردو کے تین ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی مثنویوں میں ایک حد تک خارجی پہلو کو برتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی مثنویوں میں ہم کو کہیں کہیں شیلی، بائرن، کیٹس کی مصورانہ شاعری کا خیال آنے لگتا ہے۔

انسانی فطرت کے وہ جذبات جو حُسن قدرت سے متاثر ہو کر ہمارے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، اُردو شاعری میں مقدار کے اعتبار سے کم ہیں، میر انیس نے طلوع و غروب کے جو مرقعے ہمارے سامنے پیش کئے ان میں حُسن اور صداقت تو ضرور ہے لیکن ان پر مرثیہ کا اثر غالب ہے۔

سحر البیان اور شوق قدوائی کی مثنویوں میں حُسن فطرت کو ایک حد تک نمایاں کیا گیا ہے مگر یہ ایسا ہی ہے جیسا دال میں نمک! — اُردو شاعری کی یہی وہ کمزوری تھی جس پر آزاد اور حالی نے توجہ کی اور پھر اُردو شعراء کا ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا جس نے متعدد نظمیں حُسن فطرت اور قدرت کی نیرنگیوں پر وقف کر دیں۔

ولی کمال خاں ام۔اے

جوان عمری ۔۔۔ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت سے لیکر جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں۔ اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتے بیکار ہیں، اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو کثرت آب جماع کے تصور فرمائیے اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا دزن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر دودھ آپ کے جسم میں اضافہ کرے گی، اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی یہ دوا فسادوں کو شل، کلاب کے پھول کے عرق اور مثل کندن کے ذرخالص سے تیار ہوتی ہے۔ یہ دوا فی نہیں ہے ہزاروں مایوس المعلاج اسکے استعمال سے ہمارے جوان کر شل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی ہے کہ آپ صبح دوپہر شام کھا سکتے، القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آ سکتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی چار روپیہ (للہ)

(نوٹ) زیادہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دوا فی سفت منگائیے۔ میں اشتہار کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ فقاتلوں سے ہوشیار رہئے، میری ۲۸ سالہ شہرت پر غور فرمائیے

پتہ:۔ حکیم نبابت علی نیچ زبان، خوش کلام

(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)

محمود نگر پوسٹ لکھنؤ۔ یو۔پی

کلام نازش پرتاپگڈھی

تم نے تو آج کھو ہی دیا تھا وقارِ غم،
وہ تو یہ کہئے سعیِ کرم رائیگاں گئی

جانے کون اُٹھا ہے اسکے آستانے سے
حُسن خود نکل آیا اپنے ناز خانے سے

ظلمتیں نہ کم ہوں گی اشکِ غم بہانے سے
ہوگی شامِ غم روشن طرفِ مُسکرانے سے

کچھ اس ادا سے میری طرف وہ نظر اُٹھی
جیسے کہ میں نیا ہوں، نیا غم، نئے حواس

دے رہے ہیں صدائیں وہ مجھکو
میں سمجھتا ہوں دل کی دھڑکن ہے

ستارے ڈوبتے ہیں سانس اُکھڑی جاتی ہے
یہ وقت وہ ہے کسی کا اب انتظار نہیں

ستارے مجھ سے دمِ صبح کہہ گئے نازش
جو ختم ہو نہ سحر پر وہ انتظار نہیں

کلام عرشی بھوپالی

یہ رات سہانی، یہ موسم، یہ مست ہوا، مخمور فضا
اے کاش کہ ایسے عالم میں وہ جانِ تمنا آجائے

دزدیدہ نگاہی پرزاں کی محفل میں اشارے ہوتے ہیں
ایسا نہ ہو میری نظروں پر الزام تماشا آجائے

بیتابیِ دل کے اِن نازک لمحوں کا تصور تو کیجئے
جب عہدِ محبت ہوتے ہی فرقت کا زمانا آجائے

بیانِ درد و اظہارِ الم ممکن سہی لیکن
میں کن آنکھوں سے دیکھوں گا ترے حسنِ پشیماں کو

تری نیچی نظر کی یاد کا عالم ارے توبہ
چبھو کر دل میں، جیسے توڑ ڈالے کوئی پیکاں کو

ان کا خیال ان کی تمنا ہے ان کا غم
کیا کیجے عشق پھر بھی اگر ناصبور ہے

کلام کلیم برنی

ہٹ گئیں نظروں سے نظریں مکدّر سا ٹٹ گیا
مل گئیں نظروں سے نظریں میکشی ہونے لگی

بارِ خاطر گر نہ ہو تو اس طرف بھی اک نظر
پھر مرے دردِ محبت میں کمی ہونے لگی

اوّل اوّل چھیڑ انسے آنکھوں آنکھوں میں ہوئی
آخر آخر روح سے وابستگی ہونے لگی

اے کلیم اس جانِ گلشن کا نظارہ کچھ نہ پوچھ
میں تو کیا پھولوں پہ طاری بیخودی ہونے لگی

رقص کرتی کائناتِ عشق میں روحِ نشاط
تم نے دیکھا ہی کہاں قلبِ پریشاں کی طرف

کلام دردؔ سعیدی ٹونکی

کچھ ایسے گر گئے ہیں کسی کی نظر سے ہم
ہوں جیسے ہر نگاہ میں نامعتبر سے ہم

اب اُن کے در سے کوئی تعلق نہیں، مگر
سر پھوڑتے ہیں آج بھی دیوار و در سے ہم

اکثر بیانِ غم میں اُلجھتے ہیں اس طرح
جیسے کہ اپنے حال سے ہوں بے خبر سے ہم

دیکھے ہیں انقلاب شب و روز ہم نے دردؔ
کچھ مطمئن نہیں ہیں نمودِ سحر سے ہم

یہ چونکا دیا آج کس کی ہنسی نے ؟
بہت طول کھینچا غمِ زندگی نے؟

نہ وہ راستے ہیں، نہ وہ منزلیں ہیں
بدل ہی دیا جیسے رُخ زندگی نے

ابھی آدمی آدمی کا ہے دُشمن
ابھی خود کو سمجھا نہیں آدمی نے

جہاں سیکڑوں بتکدے ڈھا دئے ہیں
خُدا بھی تراشے ہیں کچھ بندگی نے

دلچسپ معلومات

امریکہ کا شاندار ہوٹل نیویارک میں سب سے پہلا شاندار ہوٹل ولیم ایسٹر اور اُسکے چچازاد بھائی جیکب ایسٹر نے بنوایا تھا اسکا ٹھیکہ بعد میں ایک شخص برلٹ نے لیا اور ایسے یورپین فیشن کے مطابق آراستہ کیا۔ نغمہ و سرود کی چوکیاں۔ رقص گاہیں اور لوگوں کے مستقل قیام کا انتظام یہ ایسی باتیں تھیں جن کے باعث وہ بہت جلد مشہور ہوگیا۔ لیکن جب شہر کی تعمیر نو کا مسئلہ درپیش ہوا تو ۲۸ء میں اس بات کا اعلان کردیا گیا کہ اس ہوٹل کو اُڑا دیا جائے اور اسکی جگہ امپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی داغ بیل ڈال دی جائے جسے دُنیا کی سب سے اونچی عمارت ہونی چاہیئے۔ اس پر بہت جلد عملدرآمد کیا گیا، لیکن لوگوں کے دل و دماغ سے یہ ہوٹل محو نہ ہوسکا اور نیویارک کے چند لکھ پتیوں نے ۳۱ء میں چالیس لاکھ ڈالر کے صرف سے اسی نام کا ایک دوسرا ہوٹل بنوانا شروع کیا جو ۴۷ منزل کی عالیشان عمارت تھا اور جس میں ۲ ہزار ۲ سو کمرے تھے۔ جب اس کا افتتاح ہوا تو ۲۵ ہزار تماشائی اسکے دیکھنے کے لئے آئے اور صدر امریکہ نے مبارکباد کہلا بھیجی — اس وقت اس کا شمار نہ صرف امریکہ بلکہ دنیا کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں ہوتا ہے اور امرا ورؤسا یہیں قیام کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ٹیلیفون سے پوچھا "کیا بادشاہ سلامت موجود ہیں"۔ نگراں نے فہرست پر سرسری نگاہ ڈال کر پوچھا "آپ کی مراد کس بادشاہ سے ہے"۔ کیونکہ اُس وقت ہوٹل میں شاہ یونان اور شاہ یوگوسلیویا دونوں مقیم تھے۔ اسی طرح ایک موقعہ پر اس ہوٹل میں بیک وقت ۳۵۰ خارجی سیاست داں اور ۹ سفیر موجود تھے۔

یہ ہوٹل ضیافتوں کے لئے بہت مشہور ہے اور حکومت امریکہ اگر اپنے مہمانوں کو اس ہوٹل میں نہیں ٹھیراتی تو وہ اپنی توہین سمجھتے ہیں ایک موقعہ پر جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی ہونے والی تھی تو احکام موصول ہونے پر یہاں ۷۰۰ کمرے خالی کرادئے گئے۔ یہی نہیں بلکہ اُنکا سوئچ بورڈ بھی الگ کردیا اور اُس پر ایسے نگراں مقرر کئے جو انگریزی۔ فرانسیسی اور روسی تینوں زبانیں جانتے تھے — انتظام طعام کی خوبی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک موقع پر اس نے ۳ ہزار مہمانوں کے لئے ۲۴ ہزار چاندی اور ۳۶ ہزار چینی کے ظروف اور ۱۲ ہزار گلاس آناً فاناً مہیا کردئے، اُس وقت وہاں سات بڑھئی، سات ماہرین برق، ۱۵ مختصر نویس اور چار درجۂ حرارت پر قابو رکھنے والے ماہر بھی موجود تھے کھانا ختم ہونے پر جھوٹے برتنوں کو ۸۴۳ نوکر سمیٹ لے گئے اور ۵۰ نوکروں نے صرف آدھ گھنٹہ میں انھیں دھو ڈالا۔

۴۶ء میں اس کی آمدنی کا اندازہ ۱۲ لاکھ کیا گیا تھا۔

مغربی اہل قلم کی دولت آفرینی ہر چند اسکی پوری تفصیل تو معلوم نہیں کہ مغرب کے بہترین اہل قلم کتنا کماتے ہیں، لیکن وقتاً فوقتاً جو اعداد و شمار اس باب میں شائع ہوئے ہیں، اُن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مغرب میں قلم کی دولت آفرینیوں کا کیا عالم ہے۔

برطانوی مصنفین میں Sir James Barrie بڑا دولتمند انسان سمجھا جاتا تھا۔ اسنے اپنے بعد ۷۰۰،۴۰۰ پونڈ نقد اپنے ورثاء کے لئے چھوڑا اور تمام عمر اُمور خیر میں اپنی دولت صرف کرتا رہا۔ رڈیارڈ کپلنگ کی دولت کا اندازہ بھی کم و بیش اتنا ہی کیا جاتا ہے —— چارلس ڈکنس کا زمانہ اس سے بہت پہلے کا ہے، جب مغرب میں تعلیم اتنی عام نہ تھی، لیکن پھر بھی تمام عمر اسنے فراغت سے بسر کی اور جب مرا تو

۹۳۰۰۰ پونڈ کی املاک چھوڑ گیا۔ جارج مور نے اپنے بعد ۷۵۰۰۰ پونڈ اور ٹامس ہارڈی نے ۹۱۰۰۰ پونڈ کی جایداد چھوڑی۔

اسٹانلی وے مین نے جو اپنی تاریخی رومان نگاری کے لحاظ سے بہت مشہور تھا، ایک لاکھ پونڈ اپنے بعد چھوڑے۔ جان گالسوردی نے ۸۸۰۰۰ پونڈ، اور رائڈر ہیگرڈ نے ۶۱۰۰۰ پونڈ۔ انفرادی حیثیت سے کتابوں کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ ایلن ہروی کی صرف ایک کتاب Anthony Advence کی رائلٹی کا معاوضہ ابتدائی چار سال میں ۴۰ ہزار پونڈ سالانہ ملا۔ ایک اور مصنف بیری کو اسکی کتاب Little minister کی رائلٹی ۵۰ ہزار پونڈ ملی، اور میری کورلی کو اس کی ایک کتاب پر ۲۰ ہزار پونڈ۔ ایلس ہیگن رالس نے اپنی صرف ایک کتاب سے ۲۰ ہزار پونڈ کمائے۔ یہ کتاب صرف ۲۰ ہزار الفاظ کی تھی اسلئے اسکو گویا فی لفظ ایک پونڈ ملا۔ کپلنگ کو ایک بار آٹھ فسانوں کا معاوضہ صرف انگلستان کی رائلٹی سے ۲۴۰ پونڈ اور دوسرے ممالک کی رائلٹی سے ۸ ہزار پونڈ۔ اسکی ایک کتاب Kim ہے اسکی رائلٹی اسے ۵ ہزار پونڈ ملی اور ایک اخبار نے اسکی صرف ایک مختصر نظم کا معاوضہ ۲۰۰ پونڈ دیا۔ سومرسٹ ماگھم کو ایکبار صرف ایک فسانہ کا معاوضہ ایک ہزار پونڈ ملا۔ بلڈاگ ڈرمنڈ کے سلسلہ کی کتابوں کا معاوضہ سترہ سال میں اسکے مصنف کو ایک لاکھ پونڈ ملا اور بیورلی نکولس نے اپنے سلسلہ کی کتابوں سے ۲۵ ہزار پونڈ کمایا۔ سوانح عمری کی کتابوں میں لارڈ مارلے کو اپنی کتاب لائف آف گلیڈسٹون سے ۱۵ ہزار پونڈ ملے، اور مسٹر چرچل نے اپنے باپ کی سوانح حیات لکھنے پر ۸ ہزار پونڈ کمائے وارڈ ڈینگ اور Milne کو اپنی تصانیف سے ۳۰ ہزار پونڈ سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے اور بڈنگٹن کلانڈ اپنے مضامین سے ۲۵ ہزار سالانہ کماتا ہے۔ ہالی ووڈ میں مصنفین کو ۱۰۰ سے ۷۰۰ پونڈ تک فی ہفتہ ملتا ہے۔ فلم کے لئے فسانے اور ڈراما لکھنے والوں کو ہر ہر فسانہ یا ڈرامہ کے لئے ۱۰۰۰ سے ۳۳ ہزار پونڈ تک ملتا ہے۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہازران کمپنی)

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ۔

بمبئی سے :- عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی جہاز بھیج سکیں گے۔

تفصیلات کے لئے لکھئے :-

ٹرنر مارلیس اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶- بنک اسٹریٹ - بمبئی

مطبوعات موصولہ

نکتہ چین ہے غم دل

ترجمہ ہے برنارڈ شا کی مشہور تمثیل (Man & Superman) کا۔ اسکے مترجم آغا افتخار حسین بی، اے نے ترجمہ میں ایک بدعت تو یہ کی ہے کہ انگریزی نام بدل کر ہندوستانی نام رکھے ہیں اور دوسری یہ کہ کہیں کہیں حذف و اختصار سے بھی کام لیا ہے۔

برنارڈ شا کا یہ ڈرامہ اس میں شک نہیں، بڑا معرکۃ الآرا ڈرامہ ہے جس سے مصنف کی تمام ادبی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں اور اس کا ترجمہ کرنا آسان نہ تھا، لیکن فاضل مترجم نے بڑی قابلیت سے اس فرض کو انجام دیا ہے ۔ زبان صاف اور جملے سلجھے ہوئے، لیکن اگر مترجم چاہتے تو عبارت میں اس سے زیادہ صفائی و روانی پیدا ہو سکتی تھی۔ اس کا نام "نکتہ چین ہے غم دل" کیوں رکھا گیا، اس کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا حرج تھا اگر غالب کا پورا مصرعہ لے لیا جاتا۔ میری رائے میں "انسان و السنان اعلیٰ" بہتر ہوتا۔

طباعت و کتابت نفیس ہے اور کاغذ سفید و دبیز۔ حجم ۲۸۸ صفحات۔ قیمت تین روپیہ چار آنے، ناشر:۔ نفیس اکاڈمی حیدرآباد دکن۔

حیرت انگیز ملحات

ترجمہ ہے ایک مصری فاضل عبداللہ عنان کی عربی تصنیف کا جس کا نام درج نہیں کیا گیا (حالانکہ ضروری تھا) یہ کتاب اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں تاریخ اسلام کے ایک خاص اہم واقعہ کو لیکر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ کتاب کوئی تاریخی اہمیت تو نہیں رکھتی، لیکن بتصرہ تاریخی کی حیثیت ضرور رکھتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ وہ ابواب جن میں عربوں کی دینی سیاست، قرون وسطی کی غلامی، اسلامی بحری سیاست مارکوپولو کی سیاحت اور مذہبی افسانوں سے بحث کی گئی ہے، بہت دلچسپ ہیں ۔ ترجمہ بہت صاف و شگفتہ ہے لیکن بعض جگہ مقامات کے نام کو واضح نہیں کیا گیا۔ عرب مصنفین، ناموں کو بھی اپنی زبان میں ڈھال لیتے ہیں اور ان کی صورت بالکل بدل جاتی ہے، ترجمہ میں اس کی وضاحت ضروری تھی۔ مثلاً مارکوپولو کے نام کے ساتھ بندقی لکھا گیا ہے، اور کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ بندقی کیا چیز ہے۔ مترجم کو چاہئے تھا کہ حاشیہ میں ظاہر کر دیتے کہ وینس کو اہل عرب بندق یا بندقہ کہتے ہیں

ضخامت ۳۱۰ صفحات ۔ طباعت وکتابت وغیرہ بہت نفیس، قیمت تین روپیہ بارہ آنے۔ ناشر: نفیس اکاڈیمی حیدرآباد دکن

اسلامی نظریۂ اجتماع

جناب حیدر زماں صدیقی کی تصنیف ہے اور موضوع نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں اجتماعیت وقومیت پر گفتگو کی گئی ہے لیکن خالص اسلامی نقطۂ نظر سے، عقل و ضرورت کو سامنے رکھ کر اظہار خیال نہیں کیا گیا۔ اس لئے یہ کتاب صرف اُن لوگوں کے کام کی ہے جو مصالح قوم وتمدن میں بھی مذہب سے استناد ضروری سمجھتے ہیں اور بنا بران اس کی افادیت بہت محدود ہے۔

اسلام کا نظام اجتماع اور نظریۂ سیاست وقومیت خواہ کتنا ہی اچھا اور مکمل کیوں نہ ہو، لیکن اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اب سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل کی چیز ہے اور عہد حاضر میں جبکہ انسانی آبادی کو ہزاروں پیچیدہ مسایل تمدن وسیاست سے واسطہ پڑ رہا ہے، وہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے جوں کا توں ہمارے لئے مفید نہیں ہو سکتا ۔ ہر قانون وقت کے لحاظ سے مرتب ہوتا ہے اور حالات کے لحاظ سے اس میں تغیر و تبدل ضروری ہے، پھر اگر اسلام کا قایم کیا ہوا نظام اجتماعی بھی کوئی قانون ہے، تو اس میں بھی حالات کے لحاظ سے تغیر ضروری ہے مگر افسوس ہے کہ اس موضوع پر قلم اُٹھانے والے اکثر وبیشتر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اس کتاب میں سب سے زیادہ غیر افادی بلکہ ایک حد تک گمراہ کن باب وہ ہے جس میں قومیت پر بحث کی گئی ہے، کیونکہ اس زمانہ میں قومیت کی تعیین مذہبی کتابوں اور علماء قدیم کے فتووں کی بنیاد پر مسلمانوں کے لئے سخت مضرت رساں ہے۔

کاش اس کتاب میں کوئی ایسی بات بھی ہوتی جس سے ایک غیر قدامت پرست اور غیر متشدد مسلمان بھی فایدہ اُٹھا سکتا۔ ضخامت ۲۴۴ صفحات، طباعت وغیرہ نفیس ۔ قیمت دو روپیہ بارہ آنے۔

ناشر:۔ نفیس اکاڈیمی حیدرآباد دکن ۔

ہندوستان کی سیاسی اُلجھنیں

ترجمہ ہے مولانا محمد علی مرحوم کے اس انگریزی خطبہ کا جو انھوں نے کوکناڈا میں صدر کانگرس کی حیثیت سے دیا تھا۔ یہ خطبہ انگریزی کے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور ایک بہترین سیاسی مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔۔۔ وہ حضرات جو ہندوستانی تحریک آزادی کی حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

ترجمہ شاہین فاروقی نے کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ حجم ۱۳۸ صفحات، قیمت دو روپیہ بارہ آنے۔

ناشر:۔ نفیس اکاڈیمی حیدرآباد دکن

اُردو ہندی ہندوستانی

ایک پمفلٹ ہے سجاد ظہیر صاحب کا لکھا ہوا، جس میں انھوں نے اُردو، ہندی اور ہندوستانی زبانوں کی حقیقت اور ان کے باہمی تعلق پر روشنی

ڈالی ہے۔

زبان کا مسئلہ حصول آزادی سے قبل ہی بہت اُلجھا ہوا تھا، لیکن اب حصول آزادی کے بعد تو اس نے اُردو داں طبقہ کو بہت فکرمند بنا دیا ہے۔ سجاد ظہیر صاحب نے جو موجودہ ترقی پسند ادیبوں کے سرخیل ہیں، اس مسئلہ پر نہایت سلجھی ہوئی بحث کی ہے اور اخیر میں بتایا ہے کہ ہندی اور اُردو دونوں کے بقا کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ :۔ کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی۔

فرہنگ غالب تالیف ہے مولانا عرشی رامپوری کی جس میں انھوں نے فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت، ہندی اور اُردو لغات کی وہ تمام تحقیق و تشریح پیش کر دی ہے جو خود مرزا غالب نے اپنی تحریروں میں بتائی تھی۔ گویا یہ ایک ایسا فرہنگ یا لغت ہے جسے لکھا تو تھا غالب نے لیکن اس کو ترتیب دیا مولانا عرشی نے۔

مولانا نے غالب پر اس وقت تک جتنا ریسرچ کیا ہے، وہ اس قدر قیمتی ہے کہ اسے اُردو لٹریچر کے مورخین کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کے دیباچہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں نے فارسی زبان کی جو خدمت کی ہے وہ ایرانی ادیبوں سے بھی ممکن نہ ہوئی، غالب اور کلام غالب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ :۔ ناظم صاحب کتاب خانۂ رامپور۔

نئی دُنیا کو سلام مجموعہ ہے جناب سردار جعفری کی دو نظموں کا۔ پہلی نظم کا عنوان ہے "نئی دنیا کو سلام" اور دوسری نظم کا "جمہور"۔ پہلی نظم تمثیلی انداز کی ہے جس کو ہم منظوم ڈراما بھی کہہ سکتے ہیں یہ نظم ۵۵ صفحات کو محیط ہے اور موسیقی انداز میں لکھی گئی ہے نظم کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے، جس میں حصول آزادی کے بعد کے انسان کا روشن مستقبل پیش کیا گیا ہے۔ نظم کے بعض حصے قدیم شاعرانہ ٹکنک کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں اور بعض جدید ٹکنک کے حامل ہیں، جو ردیف و قافیہ اور عروضی توازن سے بے نیاز ہیں۔ سردار جعفری صاحب ترقی پسند جماعت کے ایک ممتاز رکن ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی ادب کے ذریعہ سے قومی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے بھی وہ ایک خاص درجہ رکھتے ہیں ـــ دوسری نظم جمہور سیاسی مثنوی ہے جو اُردو میں اپنی قسم کی سب سے پہلی چیز ہے۔ ان دونوں نظموں میں ہمیں بہت سی ایسی شاعرانہ بلندیاں بھی نظر آتی ہیں، جن میں نہ صرف غیر معمولی ندرت و لطافت پائی جاتی ہے، بلکہ صداقت و خلوص بھی۔ افسوس ہے کہ جدید ٹکنک کی آزاد اور ساقط الوزن شاعری سے ہم کوئی لطف نہیں اُٹھا سکے، کیونکہ ہم اسکے سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ طباعت و کتابت میں غیر معمولی اہتمام سے کام لیا گیا ہے، اور کاغذ بہت قیمتی لگایا گیا ہے۔

حجم ۱۰۶ صفحات، قیمت تین روپیہ۔ ناشر :۔ کتب پبلشرز لمیٹڈ۔ ۱۷۔ گن بو اسٹریٹ بمبئی (۱)

ممتاز فساد ہے عابدی جعفر کا لکھا ہوا۔ جو چھوٹے سائز کے ۹۴ صفحات پر شایع ہوا ہے، سرورق پر عابدی صاحب

کی تصویر کے نیچے ان کی بعض مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں کا اشتہار بھی درج ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان کا ایک اور ناول اس سے پہلے بھی شایع ہو چکا ہے، جو ہماری نگاہ سے نہیں گزرا۔

فسانہ کی عبارت صاف و سلیس ہے۔ قیمت بہ، زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ کتابی دنیا۔ لکھنؤ

شبنمستان اور رمز و کنایات

جناب فراق گورکھپوری کی غزلوں کے دو مجموعے جو حال ہی میں شایع ہوئے ہیں، ان مجموعوں میں ۱۹۱۹ء سے لیکر ۱۹۴۶ء تک کی غزلیں شامل ہیں اور اس رُبع صدی کے اندر مختلف سنین کی غزلوں کو دیکھ کر فراق کی غزلگوئی کی تدریجی ترقی کا بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ فراق کے کلام میں فنی و لسانی غلطیاں پائی جاتی ہیں، لیکن باایں ہمہ ان کے حقیقی شاعر ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، اور ان کے کلام کی معنویت ہمیں ظاہری نقایص کی طرف متوجہ ہونے ہی نہیں دیتی۔ فراق کے کلام میں ہم کو مختلف رنگ نظر آتے ہیں، لیکن میں ان کے جس رنگ تغزل کا دلدادہ ہوں وہ صرف یہ ہے:۔

جہاں میں تھی بس افواہ تیرے جلووں کی — چراغ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا
وہ اک ذرا سی جھلک برق کم نگاہی کی — جگر کے زخم نہاں مسکرائے ہیں کیا کیا

یہ مجموعہ مجلد عمدہ کاغذ پر شایع ہوا ہے۔ شبنمستان کی قیمت چھ روپیہ ہے اور رمز و کنایات کی تین روپیہ آٹھ آنے، جو سنگم پبلشنگ ہاؤس الہ آباد سے مل سکتی ہیں۔

روح کائنات

مجموعہ ہے فراق گورکھپوری کی نظموں کا اور اُن رباعیوں کا جو بہ لحاظ موضوع روپ کی رباعیوں سے مختلف ہیں۔ نظموں کی تعداد ۴۸ ہے جن میں سے اکثر غزلیاتی رنگ کی ہیں، لیکن بہ تحقیق۔ سب سے طویل نظم "روح کائنات" ہے جس میں "انسان و انسانیت" کی حقیقت کو مرموز لیکن نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ باقی نظمیں بھی بہ لحاظ موضوع و انداز بیان اپنی جگہ مکمل ہیں۔ "ایطا و شایگاں" کا عیب چونکہ فراق کے نزدیک کوئی عیب نہیں، اس لئے اس کا ذکر فضول ہے۔

قیمت چار روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ سنگم پبلشنگ ہاؤس۔ الہ آباد۔

"نگار" کے ایجنٹوں سے

آیندہ جنوری ۴۸ء کا پرچہ "جوبلی نمبر" ہے، جس کا مفصل اشتہار صفحہ (۲) پر درج ہے۔
اس کی قیمت غیر خریداران نگار سے تین روپیہ علاوہ محصول لی جائے گی اور ایجنٹوں کو فی کاپی ایک روپیہ کمیشن ملیگا۔
اس لئے جلد از جلد اطلاع دیجئے کہ آپ کو کتنی کاپیاں درکار ہیں۔ بار بار آپ اس نمبر کو نہیں منگا سکتے، اس لئے پہلا آرڈر سوچ سمجھ کر دیجئے۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

۱— چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲— مادیئن کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الیاس

مولفۂ نیاز فتحپوری جسکے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ [illegible] جو ریویو اڈیشن [illegible] اور [illegible] کا خاص اہتمام کیا گیا ہے

قیمت ڈیڑھ روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے بادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور انکا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً:- مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جن کا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

قیمت حصۂ اول للعہ۔ حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقال جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت [illegible] محصول

زیر طبع

مطالعات نیاز

حضرت نیاز کے علمی و تاریخی مقالات کا مجموعہ

طیار ہے

من و یزداں

حضرت نیاز فتحپوری کے اُن مذہبی مقالات کا مجموعہ جنھوں نے دنیائے مذہب میں ہلچل ڈالدی تھی

قیمت [illegible]

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء
(مصحفی نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
حیات مصحفی۔ اردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔
مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں
انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء
(نظیر نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
نظیر کا مسلک
شاعری پر تبصرہ
نظیر اور عوام
انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء
یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے۔ یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعرا نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۲ء
اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری ۱۹۴۱ء میں شایع ہوا تھا۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء
اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء
(قرآن نمبر) اس میں ڈاکٹر لٹنر ڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ ——— قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری، مارچ سنہ ۴۶ء
یہ سالنامہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے پہلا حصہ جنوری کا ہے اور دوسرے حصہ میں فروری، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں۔ قیمت ہر حصہ کی ۸ر

جنوری سنہ ۴۷ء
اس سالنامہ کا نام "ماجد دریابادی نمبر" ہے جس میں ایک بے مثل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار تصنیف کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرت اشتہار

	یک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
صفحہ	۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
نصف صفحہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
ربع صفحہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ۔ ششماہی جاری نہیں ہو سکتا۔ سالانہ بیرون ہند دس روپیہ۔
(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا

— کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے۔ منیجر —

جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار

مطبوعہ نگار پریس لکھنؤ (ایڈیٹر: ایس حسین)